آزادی کی راہیں

برٹرینڈ رسل

آزادی کی راہیں

برٹرینڈرسل

18- مزنگ روڈ لاہور

فون: 7249218-7237430

E-mail:FictionHouse2004@hotmail.com

نام کتاب ⇦ آزادی کی راہیں

مصنف ⇦ برٹرینڈرسل

پبلشرز ⇦ فکشن ہاؤس

18- مزنگ روڈ' لاہور

فون : 7249218-7237430

پروڈکشن ⇦ ظہور احمد خاں

کمپوزنگ ⇦ فکشن کمپوزنگ سنٹر' لاہور.

پرنٹرز ⇦ زاہد بشیر پرنٹرز' لاہور

اشاعت ⇦ 2002ء

قیمت ⇦ 100 روپے

❋ ❋ ❋

فہرست

دیباچہ

سماج کو تباہ کن الجھاؤ سے نکال کر ایک بہتر اور نیا روپ دینے کا خیال کوئی نیا نہیں ہے۔ افلاطون ہی کے زمانہ سے جس کی کتاب "جمہوریت" بعد کے فلسفیوں کے لیے نمونہ بنی رہی۔ یہ خیال کسی نہ کسی رنگ میں چلا آ رہا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر وہ انسان جو دنیا کو کسی آئیڈیل کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ اس کے زاویہ نگاہ کا مفہوم علم آرٹ محبت یا اس کے سوا بھی کچھ ہو۔ ان برائیوں کا ضرور ماتم کرتا ہے۔ جو ابتدائی انسانی زندگی میں داخل ہو چکی ہیں۔ اگر وہ قوت و ہمت رکھتا ہے تو لوگوں کو بھلائی کی طرف لے جانے کے لیے اس کے دل میں تڑپ اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ سوشلزم اور انارکزم کی داغ بیل ڈالنے والوں کے سینوں میں بھی یہ جذبہ تھا۔ اور اسی نے ماضی میں جمہوریتوں کے پیدا کرنے اور فروغ دینے والوں کو حرکت بخشی۔ یہ کوئی نرالی بات نہیں۔ سوشلزم اور انارکزم کی اشاعت کا راز موجودہ انسانی دکھوں میں اس گہرے تعلق کی پیدائش ہے جس نے بے دست و پا مفکروں کی امیدوں کو سیاسی تحریکوں کا محرک بنایا۔ یہی سوشلزم اور انارکزم کی اہمیت کا راز ہے اور یہی چیز ان تحریکوں کو ان لوگوں کے لیے خطرناک بنا رہی ہے۔ جو جان بوجھ کر یا انجان بن کر موجودہ سوسائٹی کی برائیوں پر پردہ ڈال رہے ہیں۔

عام حالات میں لوگوں کا ذہن ذاتی یا بیرونی معاملات کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ سماج میں وہ اپنا ایک خاص مقام اور ماحول فرض کر لیتے ہیں۔ اور اسی رنگ میں زندگی گزار دیتے ہیں۔ ان کا ذہن فکر فردا سے خالی ہوتا ہے۔ اور وہ بالکل حیوانوں کی طرح وقتی ضرورتوں کی تسکین کا سامان کرتے ہیں۔ ان میں یہ سوجھ پیدا ہی نہیں ہوتی کہ اپنی کوشش اور ہمت سے زندگی کی حالت کو بدلا بھی جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک خاص گروہ ذاتی خیال اور قوت ارادی کو کام میں لا کر خوش نصیب بن جائے۔ لیکن

ایسے انسانوں کی تعداد بہت کم ہے جوان آسائشوں کو جنہیں وہ اپنے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ دوسروں کے لیے بھی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ صرف گنتی کے چند لوگوں میں انسانی ہمدردی کا یہ جذبہ پایا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو برائیوں اور دکھوں کے بوجھ تلے دم توڑتے نہیں دیکھ سکتے۔ خواہ ان کی اپنی زندگی سے ان کا ظاہرا کوئی لگاؤ نہ ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جو سوسائٹی کے کسی نئے نظام کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جس سے زندگی مسرتوں سے سیراب اور بھرپور ہو سکے۔

آج سے پہلے انسانی کوشش ان ناانصافیوں کے شکاروں میں ایک رشتہ اتحاد پیدا کرنے میں ناکام رہی۔ اور یہ دکھ لاعلاج سمجھا گیا۔ انسانوں کا وہ بدنصیب طبقہ جو جاہلیت کے جال میں پھنس کر تکان اور مشقت کی زیادتی کا شکار ہوا تھا۔ اپنی پستی کے احساس اور برسراقتدار انسانوں کے تشدد کے خوف سے اخلاقی طور پر بھی ناقابل اعتبار سمجھا گیا۔ ایسی جماعت کو سدھار کر ان میں قوت عمل کا جذبہ پیدا کرنا ناممکن تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ تعلیم کی روشنی اور مزدوروں میں معیار آسائش کی بلندی نے نئے حالات پیدا کر دیئے ہیں۔ جو ماضی کی کسی رسم تجدید کی نسبت زیادہ موافق نظر آتے ہیں اور آج سب سے بڑھ کر سوشلسٹ اور اس سے کم انارکسٹ (سنڈیکلزم (Syndicalism) کو فروغ دینے والوں کی حیثیت سے) اس تحریک کے علمبردار ہیں۔

سوشلزم اور انارکزم کی خوبی شاید اس میں ہے کہ ان کی گود ایسے خیالات سے بھرپور تھی۔ جو نئی زندگی دے سکیں۔ اس آئیڈیل کی وضاحت پہلے پہل مصنفوں نے کی اور پھر مزدور جماعتوں کے طاقتور طبقوں نے انہیں عملی طور پر مشعل راہ بنا لیا۔ سوشلزم کے بارے میں تو یہ بات بالکل درست ہے اور کسی حد تک انارکزم کے متعلق بھی۔ انسانی ذہن نے تو انارکزم کو بہت کم قبول کیا اور وہ بھی صنعت و حرفت کی اشتراکی تنظیم کی صورت میں کسبی اشتراکیت کی بنیادیں جماعت بندی پر ہیں۔ اس کا ماخذ انارکزم ہے کیونکہ جن لوگوں نے اسے قبول کیا۔ بہت حد تک انارکسٹ تھے۔ انارکی اور کسبی اشتراکیت مین ایک آئیڈیل اور اس کی تنظیم کا رشتہ ہے۔ ایک ایسا ملاپ جو سوشلسٹ سیاسی پارٹیوں میں پایا جاتا ہے۔ ہم ان تحریکوں کا مطالعہ اسی نکتہ نظر سے کریں گے۔

سوشلزم اور انارکزم اپنی موجودہ شکلوں میں مارکس اور بکونن کی پیداوار ہیں۔ ہم پہلے ان کی تعلیمات اور پھر ان جماعتوں کا تذکرہ کریں گے۔ جن کی انہوں نے عمارت چنی یا بنیاد رکھی۔ اس سے ہم ماضی قریب میں سوشلزم کے پھیلاؤ اور اس کے بعد سوشلسٹوں کے سلطنت اور سیاسی اقدام پر دباؤ ڈالنے کے خلاف کسبی اشتراکیوں کی بغاوت اور ایسی تحریکوں کو سمجھ سکیں گے جو کسبی اشتراکیت سے تھوڑی بہت ملتی جلتی ہیں۔ جیسے انگلینڈ میں گلڈ سوشلزم وغیرہ اس تاریخی مطالعہ کے بعد ہم مستقبل کے کچھ مسائل کا تذکرہ کریں گے اور فیصلہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ کہ اگر سوشلزم یا کسبی اشتراکیت کے مقاصد کامیاب ہو جائیں تو دنیا کن پہلوؤں سے شگفتہ ہو گی۔

میرا اپنا خیال ہے کہ خالص انارکزم اگرچہ ہماری آخری منزل ہونی چاہیے۔ لیکن آج ناممکن ہے۔ اور اگر اسے اختیار بھی کر لیا جائے تو شاید وہ دو یا تین سال تک دم توڑ دے۔ دوسری طرف مارکسی سوشلزم اور کسبی اشتراکیت' بہت سے نقائص کے باوجود زندگی کو آج سے اور سہانا بنانے کے قابل ہیں۔ اگرچہ دونوں کو بہترین نظام نہیں کہا جا سکتا۔ مارکسی سوشلزم میں سلطنت کے ہاتھ بہت زیادہ قوت چلے جانے کا اندیشہ ہے۔ لیکن دوسری طرف کسبی اشتراکیت بھی جس کا مقصد سلطنت کو ختم کر دینا ہے۔ میرے نزدیک بہترین قابل عمل نظام گلڈ سوشلزم ہے۔ جو مختلف تجارتوں میں اتحاد قائم کرتے ہوئے دونوں نظاموں کی خوبیاں چن لیتا ہے۔ اس وقت ''تعمیر اساسی'' سے متعلقہ نئی تحریکوں کی تاریخ دہرانے سے پہلے چند امور کا تذکرہ ضروری ہے۔ جو اکثر سیاسی نظریوں میں تمیز کرتا ہے اور پبلک ان کے متعلق غلط فہمیوں میں پھنسی ہوئی ہے میں انصاف کے ساتھ ان اسباب پر غور کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ سب بات روشن ہو سکے کامیاب تحریکوں کے لیڈر خشک زمین ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ان کی زندگی سے ظاہر ہے اگرچہ ان میں بھی دوسرے ترقی یافتہ کی سی اہلیت ہوتی ہے۔ لیکن نہ وہ دولت اکٹھی کر سکتے ہیں اور نہ اپنے زمانہ کے ہجوم کی جبیں اپنے در پر جھکا سکتے ہیں۔ جن لوگوں میں بازی جیتنے کی اہلیت ہوتی ہے۔ وہ بھی اسی قدر کام کرتے ہیں۔ جس قدر بازی کے جیتنے والے لیکن وہ دانستہ طور پر ایسی راہ اختیار کر لیتے ہیں جس میں جیت ناممکن ہو جاتی ہے ان کے متعلق جان لینا چاہیے کہ ذاتی ترقی کے سوا بھی ان کی زندگی کا مقصد

ہوتا ہے ان کی زندگیوں کی جزئیات میں ذاتی اغراض کی ملاوٹ ہو تو بھی ان کی نیت غرض سے پاک ہوتی ہے۔ سوشلزم' انارکزم اور سنڈیکلزم کی داغ بیل ڈالنے والے قید جلاوطنی اور افلاس کے کاری زخموں کا شکار ہو رہے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنا پراپیگنڈا نہیں چھوڑتے تھے اور اپنے اس وطیرہ سے انہوں نے ثابت کر دیا کہ ان کا جوش و خروش ذاتی اغراض کی تسکین نہیں بلکہ نوع انسانی کے لیے ہے۔ بہرکیف اگرچہ ایسے لوگوں کی زندگی انسانی بہتری کے لیے صرف ہوتی ہے۔ بلکہ عموماً" دیکھا گیا ہے۔ کہ ان کی تقریروں اور تحریروں میں پیار کی نسبت نفرت کا رنگ کہیں شوخ تر ہوتا ہے اور اس کی وجہ غالباً" یہ ہے کہ مختلف نوعیت کی مخالفتوں اور مایوسیوں کے وجہ سے ان کا پیمانہ حیات نفرت سے بھرنے لگتا ہے اور جس قدر اسے اپنے ارادوں کی پاکیزگی اور وعظ کی صداقت پر یقین ہوتا ہے۔ وہ اسی قدر زیادہ مخالفت پر برہم ہوتا ہے۔ عوام کی خشک زندگی کے بے حسی کو برداشت کرتا ہے۔ ایک فلسفی کی طرح' انقلاب کے مخالفوں کے طعنے سنتا ہے۔ لیکن ان کو وہ کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ جو سوسائٹی کی اصلاح کے لیے مختلف اور کوئی نیا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے اعتقادات کی خاطر وہ تکلیفات برداشت کرتا ہے اور اس کا یقین کامل ہی اس کے اعتقادات کو اس کی نگاہوں میں اور بھی روشن کر دیتا ہے اور اگر کوئی سوجھ بوجھ والا انسان ان کو رد کرتا ہے تو اس کے نزدیک وہ ضرور بددیانت اور اس مقصد کو دغا دینے کی مکروہ نیت کو دل میں چھپائے ہے۔ یہیں سے فرقہ واری کی روح جاگ اٹھتی ہے اور یہی وہ زہر ہے۔ جو غیر مقبول دستور العمل پر سختی سے عمل کرنے والوں کی رگوں میں سرایت کر چکا ہے۔ لیڈروں میں نمائش کا جذبہ جسے وہ کسی نئی راہ عمل کے اختیار کرنے کے خیال میں فراموش کر دیتے ہیں۔ کسی نئے روپ میں مثلاً ذہنی تسلط یا اپنے گروہ کے اقتدار کی آرزو میں ابھر آتا ہے۔ ان باتوں کا یہ اثر ہوتا ہے کہ زبردست اصلاح کے علمبردار مخالف سکولوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ کیچڑ اچھالتے ہیں اور ہر اس مقرر یا ادیب سے جس کی وہ تعریف کرتے ہوں۔ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ بھی ان کے تعصبات پر ایمان لائے اور ان کے عقائد کے سانچے میں اپنی تعلیمات کو ڈھال لے کیونکہ یہی صحیح راستہ ہے اس دماغی کیفیت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے انسانی

بہتری کے لیے سب کچھ قربان کر دیا ہوتا ہے۔ محبت سے زیادہ نفرت میں لتھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایمان کی پختگی کا مطالبہ ہی ذہن کے آزاد استعمال کی راہ میں رکاوٹ ہوتا ہے۔ یہ اسباب اور معاشی تعصب اچھے دماغوں کا انتہا پسند ریفارمروں کے ساتھ عملی تعاون دشوار کر دیتے ہیں۔

ریڈیکل ریفارمروں کے متعلق عام لوگوں کی غلط فہمی کا سبب یہ بھی ہے کہ وہ موجودہ سوسائٹی کے اداروں کو اختلافی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہر چند اپنے ہمسایوں کی نسبت انہیں اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ فطرت انسانی میں بہتر زندگی کی پیدائشی قابلیت موجود ہے لیکن اداروں کے ظلم اور دباؤ کے احساس کی وجہ سے وہ ان اداروں کی اصلاح کرنے کی بجائے انہیں کلبیت (Cynicism) کا ایک گمراہ کن نقش بنا دیتے ہیں۔ اکثر لوگوں میں فطری طور سے عمل کی دو مختلف لہریں ہوتی ہیں۔ ایک کی گود میں ان کے رفیق اور دوست اور دوسری کی زد میں ان کے دشمن یا وہ لوگ جنہیں وہ سوسائٹی کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ ریڈیکل ریفارمر اپنی زیادہ توجہ اس دوسری جماعت کے ساتھ برتاؤ پر دیتے ہیں اس جماعت میں دشمن اور مجرم شامل ہوتے ہیں۔ مگر جن کے دماغ اپنی یا حقوق کی حفاظت کے لیے انقلاب کو مضر سمجھتے ہیں۔ ان میں وہ بھی شامل ہیں جن کی اپنی زندگی معاشی بدحالی کے سبب مطمئن نہیں۔ ایک عام شہری ایسے لوگوں یا جماعتوں کے متعلق کم سوچتا اور زندگی اسی خیال کے ساتھ گزار دیتا ہے کہ وہ اور اس کے دوست سبھی بھلے لوگ ہیں۔ کیونکہ وہ کسی کو فرقہ وارانہ دشمنی کے باعث دکھ نہیں دینا چاہتے۔ یہ ظاہر ہے کہ وہ شخص جس کی توجہ ایک گروہ کے دوسرے گروہوں کے تعلقات سے وابستہ ہے جنہیں وہ کوستا ہے۔ یا ان سے ڈرتا ہے۔ بالکل مختلف فیصلہ دے گا۔ ایسے حالات میں تلخ حقیقتوں کا سامنا یقینی ہے اور انسانی طبیعت کا بہت بھونڈا پہلو سامنے آ جاتا ہے سرمایہ داری کے مخالفوں نے بعض تاریخی واقعات سے پڑھ لیا ہے کہ اس قسم کی درندگی اکثر سرمایہ داروں اور سلطنت کی طرف سے مزدور جماعتوں کے خلاف ظاہر کی گئی ہے خصوصاً" جب کبھی انہوں نے ان ناقابل بیان تکلیفوں کے خلاف چیخ پکار کی اس صنعتی نظام کے خلاف جس میں وہ جکڑے ہوئے ہیں۔ یہاں سے ایک خوش حال شہری کے سوسائٹی کے متعلق نئے نظریے کی وضاحت

کا آغاز ہوتا ہے۔ جو اسی قدر درست اور شاید نا درست بھی ہے۔ لیکن درحقیقت واقعات پر مبنی---- واقعات جو دوستوں کی جگہ دشمنوں کے ساتھ تعلقات سے متعلق ہوتے ہیں۔

جماعتی لڑائی قوموں کی لڑائی کی مانند دو مخالف خیال پیدا کر دیتی ہے جن میں سے ہر ایک مساوی طور پر درست یا نا درست ہوتا ہے۔ ایک جنگ میں شریک قوم کا شہری اپنے ہم ملکوں کا خیال کرتا ہے۔ تو اس کے سامنے ان کا حسن سلوک ہوتا ہے وہ اسے مہربان اور اچھے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن مخالف قوم کے افراد پر وہ نظر ڈالتا ہے۔ بالکل مختلف زاویہ سے۔ لڑائی میں ان کی درندگی یا ڈپلومیسی کی روشنی میں کیونکہ فضا مختلف ہے۔ یہی کیفیت ان کی ہے جو سرمایہ دار کو انقلابی مزدور کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ سرمایہ دار کو وہ گمان سے بڑھ کر غلط کار نظر آتے ہیں۔ کیونکہ واقعات جن پر انقلابی مزدور کا نظریہ قائم ہے ایسے واقعات ہیں جن کو سرمایہ دار جان نہیں سکتا یا جان بوجھ کر فراموش کر دیتا ہے۔

میں نے شروع ہی میں ان خیالات کو پیش کر دیا ہے تاکہ قاری پر ان تحریکوں کی تلخی اور نفرت عیاں ہو جائے۔ جن کا ہم جائزہ لینے والے ہیں۔ ان کا سرچشمہ تلخی یا نفرت نہیں۔ بلکہ محبت ہے۔ یہ درست ہے کہ جو لوگ ہماری محبت کے تصور کو اذیت دیتے ہیں ان سے نفرت کرنا دشوار ہے۔ تاہم ناممکن نہیں۔ صرف نظریہ کی وسعت اور فہم کی فراخت کی ضرورت ہے۔ بہرحال یہ آسان کام نہیں۔ اگر سوشلسٹوں اور انارکسٹوں نے کبھی خرد کو خیرباد کہہ دیا تو یہی حال ان کے مخالفوں کا ہے۔ ان کا طرز عمل ان سے برتر ہے۔ جنہوں نے ناسمجھی یا کسی قدر ڈھیٹ پن سے موجودہ نظام کی ناانصافی اور سختی کے آگے سر جھکا دیا ہے۔

برٹرینڈ رسل

پہلا باب

مارکس اور سوشلسٹ فلسفہ

سوشلزم کوئی مکمل فلسفہ نہیں بلکہ ایک رجحان ہے۔ اس کی تعریف میں بعض غیر اشتراکی باتوں کا آ جانا اسی قدر یقینی ہے۔ جس قدر بعض اشتراکی باتوں سے گریز۔ لیکن میرے خیال میں اگر سوشلزم کو زمین اور سرمایہ کی اجتماعی ملکیت کی دعویدار کہیں تو ہم اس کی روح کے بہت قریب پہنچ جاتے ہیں۔ اجتماعی ملکیت سے مراد جمہوری سلطنت کی ملکیت ہوسکتا ہے۔ لیکن غیر جمہوری سلطنت کے قبضہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا انارکسٹ کمیونزم کی طرح اسے ان جبری طاقتوں کے بغیر جو سلطنت کی روح و رواں ہیں جماعت کے مرد و زن کے آزاد تعاون کی ملکیت کہا جا سکتا ہے۔ بعض سوشلسٹ کسی تہلکہ مچا دینے والے انقلاب کے ذریعہ اس اجتماعی ملکیت کی آرزو کرتے ہیں اور بعض آہستہ آہستہ' بعض زمین اور سرمایہ پر جمہور کے پورے اختیار پر زور دیتے ہیں۔ جب کہ دوسرے اسے طوفان خیز نہیں دیکھنا چاہتے لیکن ان سب میں موجودہ سرمایہ داری نظام کا کم و بیش خاتمہ اور جمہوریت مشترک ہے۔ سوشلسٹ انارکسٹ یا سنڈیکلسٹ میں فرق زیادہ تر جمہوریت کی نوعیت پر ہے۔ پکے سوشلسٹ حکومت کے دائرہ میں۔ پارلیمانی جمہوریت کے قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے مٹنے کے ساتھ ساری موجودہ خرابیاں بھی مٹ جائیں گی۔ اس کے برعکس انارکسٹ اور سنڈیکلسٹ سرے سے پارلیمنٹ کے خلاف ہیں اور جماعت کے سیاسی معاملات کو مختلف طریقوں سے سلجھانا چاہتے ہیں لیکن سب کے سب اس لحاظ سے

جمہوری ہیں کہ وہ ہر قسم کی مراعات اور ہر قسم کی بناوٹی ناہمواری کو مٹانا چاہتے ہیں۔ موجودہ سوسائٹی میں سب مزدور کے حامی ہیں۔ سرمایہ اور اجرت کے موجودہ نظام کو دولت مند طبقہ کے مفاد کے لیے مزدوروں کو لوٹنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اجتماعی ملکیت کی کوئی صورت ہی مزدور کو نجات دلاسکتی ہے۔ لیکن اس مشترک فلسفہ کے اندر بھی بہت سے اختلاف ہیں اور جنہیں پکے سوشلسٹ کہا جاتا ہے۔ ان کے خیالات میں بھی کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ سوشلزم ایک قوت کی حیثیت سے مارکس کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انگلینڈ اور فرانس میں اس سے پہلے بھی اشتراکی نظریئے موجود تھے۔ یہ بھی درست ہے کہ فرانس میں 1848ء کے انقلاب کے وقت سوشلزم کا تھوڑے سے وقت کے لیے دستور میں کافی رسوخ ہو گیا۔ لیکن مارکس سے پہلے کے سوشلسٹ خلد کے خوابوں میں کھو گئے۔ اور کوئی پائیدار سیاسی پارٹی قائم نہ کر سکے۔ اینگلز کے تعاون کے ساتھ مارکس نے اشتراکی فلسفہ کی متحد جماعت بنائی۔ جو کافی تعداد کے دماغوں پر چھا جانے کی صلاحیت یا سچائی رکھتی تھی۔ اور اس بین الاقوامی سوشلسٹ تحریک کی بنا ڈالی جو پچھلے پچاس سال سے یورپ بھر میں بڑھ رہی ہے۔

مارکس کا فلسفہ سمجھنے کے لیے ان اثرات سے تھوڑی سی واقفیت ضروری ہے جنہوں نے اس کے نظریہ کو جنم دیا۔ وہ ٹیوس کے مقام پر 1818ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ یہودی تھا جس نے برائے نام عیسائیت قبول کر لی تھی اور قانونی عہدہ دار تھا۔ مارکس نے جرمنی کی مختلف یونیورسٹیوں میں قانون' سیاسیات' مالیات اور تاریخ کا مطالعہ کیا۔ فلسفہ میں اس نے ہیگل کے خیالات کو اپنایا جو اس وقت اپنی شہرت کے معراج پر تھا۔ اور اس پر زندگی بھر ان خیالوں کا کچھ نہ کچھ اثر قائم رہا۔ ہیگل کی طرح اس نے تاریخ میں ایک تصور کو بڑھتا ہوا پایا۔ اس نے دیکھا کہ دنیا کے الٹ پھیر ایک منطقی نمو ہیں۔ جسکے تصادم کے ذریعے ایک رنگ دوسرے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جو

اس کا الٹ ہوتا ہے۔ لیکن ہیگل کے زیادہ واضح نظریوں میں سے مارکس نے جوانی کے بعد کچھ بھی یاد نہ رکھا۔ وہ پروفیسر یا کسی عہدیدار کی حیثیت سے شاید اچھے دن دیکھ لیتا۔ لیکن سیاست سے اسکی دلچسپی اور ریڈیکل خیالات اسے زیادہ دشواریوں میں لے گئے۔ 1842ء میں وہ ایک اخبار کا ایڈیٹر ہو گیا جسے پروشین حکومت نے دوسرے سال کے شروع میں اس کے بڑھتے ہوئے خیالات کے سبب دبا دیا۔ اس واقعہ نے مارکس کو پیرس جانے پر مجبور کیا۔ جہاں وہ اشتراکی کی حیثیت سے معروف ہوا اور وہاں اس نے اپنے فرانسیسی پیش رووں کا مطالعہ کیا۔ 1844ء میں اس کی اینگلز کے ساتھ عمر بھر کی دوستی کا آغاز ہوا جو مانچسٹر میں کاروبار کرتا تھا۔ برطانوی سوشلزم سے اس نے واقفیت حاصل کی۔ اور اس کے نظریوں کو بہت حد تک اپنایا۔ 1845ء میں مارکس پیرس سے بھی نکالا گیا۔ اور اینگلز کے ساتھ بروسیلز چلا گیا۔ وہاں اس نے جرمن مزدور سبھا بنائی۔ اور ایک پرچہ نکالا۔ بروسیلز میں اپنی سرگرمیوں کے باعث پیرس کی جرمن کمیونسٹ لیگ اس سے آشنا ہو گئی۔ جس نے 1847ء کے انجام میں اسے اور اینگلز کو ایک اعلان تیار کرنے کے لیے دعوت دی۔ جو جنوری میں شائع ہو گیا۔ یہی وہ مشہور "اشتراکی اعلان" ہے جس میں پہلی بار مارکس کا نظریہ پیش کیا گیا۔ اس کی اشاعت بھلے وقت میں ہوئی۔ اگلے مہینہ پیرس میں انقلاب پھوٹ پڑا۔ اور مارچ میں جرمنی تک پھیل گیا۔ انقلاب کے خوف نے حکومت کو بلجیم سے مارکس کے نکالنے پر اکسایا۔ لیکن جرمن انقلاب نے اس کا اپنے ملک میں لوٹنا ممکن کر دیا۔ جرمنی میں اس نے پھر ایک اخبار شروع کیا جس سے اس کی پھر حاکموں سے جھڑپ ہو گئی۔ جو رجعت پسندی کے زور پکڑنے کے ساتھ ہی شدید ہو گئی جون 1848ء میں اس کا اخبار دبایا گیا اور اسے پروشیا کی حدود سے نکال دیا گیا وہ پیرس پہنچا۔ لیکن وہاں سے بھی خارج کر دیا گیا۔ اب اس نے انگلینڈ کا رخ کیا اور انگلینڈ میں بغاوتی مقصدوں کے تھوڑے سے وقفوں کے علاوہ 1883ء تک وہیں رہا۔ اس کا اکثر وقت اپنی ضخیم کتاب "سرمایہ" کی تیاری میں

صرف ہوتا۔ آخری سالوں میں اس کا دوسرا کام بین الاقوامی مزدور سبھا کا بنانااور پھیلانا رہا۔ 1840ء سے بعد کا زیادہ وقت اس نے برٹش میوزیم میں جرمن صبر کے ساتھ سرمایہ داری سماج کا بھانڈا پھوڑنے کے لیے مواد اکٹھا کرنے میں صرف کیا۔ لیکن انٹرنیشنل سوشلسٹ تحریک کی لگام بھی ہاتھ میں رکھی۔

مارکس کے نظریوں میں تین نہایت اہم ہیں---- تاریخ کا مادی نکتہ نگاہ' سرمایہ کو مرکز پر لانے کا قانون اور تیسرا جماعتی لڑائی۔

1- تاریخ کا مادی نکتہ نگاہ

مارکس کا خیال ہے کہ انسانی سوسائٹی کے تمام مدارج کی جان مادی حالات ہیں۔ اور انہیں وہ اقتصادی نظام کے روپ میں دیکھتا ہے سیاسی دستور قانون' مذہب' فلسفہ اپنی وسیع حدوں میں سب اقتصادی نظام کے سوانگ ہیں۔ یہ کہنا زیادتی ہے کہ وہ دانستہ مالی ہوس کو سب سے اہم سمجھتا ہے۔ البتہ اس کا خیال ہے کہ اقتصادیات شخصیت اور خیال کو ڈھالتی ہے اور اس لحاظ سے اکثر ان باتوں کا سبب ہے جو بظاہر بے لگاؤ نظر آتی ہیں وہ اپنے نظریہ کو دو انقلابوں پر چسپاں کرتا ہے۔ ایک ماضی میں اور دوسرا مستقبل میں۔ گذشتہ انقلاب جاگیرداری نظام کے خلاف بورژوا کا ہے۔ جو انقلاب فرانس کے رنگ میں ظاہر ہوا۔ آنے والا انقلاب مزدور یا پرولتاری کا بورژوا کے خلاف ہو گا۔ اور سوشلسٹ جمہوری حکومت قائم کرے گا۔ تاریخ کی مادی رو میں اسے مادی اسباب انسانی ہستیوں سے کھیلتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ سوشلسٹ انقلاب کا علمبردار نہیں پیش گوئی کرنے والا ہے۔ یہ درست ہے کہ وہ اسے اچھا سمجھتا ہے۔ لیکن اس کی زیادہ کوشش یہ ثابت کرنا ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ اس کے سرمایہ داری نظام کی برائیاں بے نقاب کرنے سے بھی یہی ظاہر ہے۔ وہ سرمایہ داروں کو اس خونریزی پر الزام نہیں دیتا۔ جس کے چھینٹے ان کی آستینوں پر دکھاتا ہے۔ وہ صرف یہ بتاتا ہے کہ جب تک زمین اور

سرمایہ کی ذاتی ملکیت کا وجود ہے وہ ایسا کرنے پر مجبور ہیں۔ لیکن ان کا ظلم ہمیشہ نہیں رہے گا کیونکہ ظلم ان قوتوں کو جنم دیتا ہے جو انجام کار اسے اڑا کر رکھ دیتی ہیں۔

2- سرمایہ کو مرکز پر لانے کا قانون

مارکس کہتا ہے کہ سرمایہ داری کاروبار روز بروز بڑھ رہے ہیں۔ اس نے بھانپ لیا کہ آزاد مسابقہ کی جگہ ٹرسٹ قائم ہونا چاہئیں اور سرمایہ داری مہموں کو گھٹا کر انفرادی کاروبار کو بڑھا دینا چاہیے۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح نہ صرف کاموں کی تعداد میں کمی ہو جائے گی۔ بلکہ سرمایہ داروں کی تعداد بھی گھٹ جائے گی۔ اس کا عام انداز گفتگو ایسا ہے۔ کہ گویا ہر کام کسی ایک آدمی کے قبضہ میں ہے اسی خیال کے ماتحت اسے توقع ہے کہ لوگ لگاتار سرمایہ داروں کے طبقہ سے پھسل پھسل کر پرولتاری بنتے جائیں گے۔ اور سرمایہ دار رفتہ رفتہ تعداد کے لحاظ سے کمزور ہوتے جائیں گے اس نے یہ اصول صنعت پر ہی نہیں بلکہ زراعت پر بھی چسپاں کیا۔ اسے امید تھی کہ جاگیردار آئے دن کم ہوتے جائیں گے اور ان کی جاگیریں بڑھتی جائیں گی۔ یہ سلسلہ سرمایہ داری نظام کی برائیوں اور ناانصافیوں کو اور اجاگر کرے گا۔ اور مخالف طاقتوں کو زیادہ ابھارتا جائے گا۔

3- جماعتی لڑائی

مارکس مزدور اور سرمایہ دار کو ایک گہرے تضاد میں مبتلا دیکھتا ہے۔ وہ گمان کرتا ہے کہ ہر آدمی آج یا کل ایک دوسرے گروہ میں حل ہو جائے گا۔ مزدور (جس کے پاس کچھ بھی نہیں) سرمایہ دار (جس کے پاس سب کچھ ہے) کے ہتھکنڈوں کا شکار ہو رہا ہے۔ لیکن ایک دن سرمایہ داری نظام کی قلعی کھل جائے گی اور بورژوا اور پرولتاری کی باہمی مخالفت زیادہ واضح ہو جائے گی۔ اور دونوں جماعتیں جن کے مفاد جدا جدا ہیں۔ باہمی جنگ پر مجبور ہو جائیں گی۔ جس سے سرمایہ داری نظام کے اندر بگاڑ پیدا ہو

جائے گا۔ مزدور طبقہ لوٹنے والوں کے خلاف پہلے مقامی پھر قومی اور آخرکار بین الاقوامی طور پر ایک ہونے لگے گا۔ اور ان کے بین الاقوامی اتحاد ہی میں ان کی کامیابی ہے۔ اس وقت وہ کہہ دیں گے کہ ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست۔ لوٹ کھسوٹ ختم ہو جائے گی سرمایہ دار کا ظلم ممکن نہیں رہے گا۔ سوسائٹی جماعتوں میں بٹی ہوئی نہیں ہو گی اور سب لوگ آزاد ہوں گے۔

یہ سب باتیں "اشتراکی اعلان" میں لکھی ہوئی ہیں جو حیرت انگیز قوت اور حوصلہ کی تصنیف ہے اور دنیا کی بڑی بڑی قوتوں کی یادگار لڑائی اور اٹل تباہی کا نچوڑ پیش کرتی ہے۔ سوشلزم کی ترقی میں اس کی اس قدر اہمیت ہے اور وہ "سرمایہ" میں بیان کیے ہوئے نظریوں کو ایسے شاندار رنگ میں پیش کرتی ہے۔ کہ اس کی چنی ہوئی عبارتیں ہر اس شخص کو یاد ہونی چاہئیں جو مارکسی سوشلزم کے اس اثر کو سمجھنا چاہتا ہے۔ جو اسے مزدور جماعت کے اکثر لیڈروں کے دل و دماغ پر حاصل ہے۔

وہ شروع کرتا ہے کہ "یورپ پر ایک بھوت سوار ہے اور وہ کمیونزم کا بھوت ہے بوڑھے یورپ کی ساری طاقتیں اس کو نکالنے کے لیے ایک مقدس اتحاد کر چکی ہیں۔ پوپ اور زار' فرانسیسی ریڈیکل اور جرمن جاسوس کوئی مخالف جماعت ایسی نہیں جسے صاحب حکومت دشمنوں نے اشتراکی کہہ کہہ کر رسوا نہ کیا ہو۔ کس جگہ مخالفوں نے اپنے سے زیادہ بڑھی ہوئی مخالف جماعتوں کو کمیونزم کے جھلنے والے نام نہیں دیئے" جماعتی جنگ کا وجود کوئی نیا نہیں ہے۔ اس وقت تک کی ساری تاریخ جماعتی لڑائیوں کی تاریخ ہے ان لڑائیوں میں ہر جگہ جھگڑا سوسائٹی کی انقلابی تجدید یا الجھی ہوئی جماعتوں کی مشترکہ تباہی پر ختم ہوا۔ "ہمارا دور---- بورژوا کا دور جماعتی مخالفت کو سادہ کر چکا ہے سماج مجموعی طور پر دو بڑے مخالف ٹولوں میں بٹ رہی ہے جو ایک دوسرے کے بالکل مقابل کھڑے ہیں---- بورژوا اور پرولتاری" اس کے بعد جاگیرداری نظام کے زوال کی تاریخ ہے۔ جس میں بورژوا کو انقلابی طاقت کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔

"تاریخی طور پر اس طبقہ نے بہت انقلابی کام کیا ہے" مذہبی اور سیاسی آڑوں میں چھپائی ہوئی لوٹ مار کے بدلے اس نے ننگی بے حیا براہ راست اور وحشی لوٹ کو لا کھڑا کیا۔ اپنی پھیلتی ہوئی پیداوار کے لیے منڈیوں کی طلب میں بورژوا نے روئے زمین کو چھان مارا "اپنے سو سال کے دور حکومت میں بورژوا نے پہلی تمام نسلوں سے زیادہ ٹھوس اور عظیم الشان پیداواری قوتیں پیدا کی۔" "جاگیرداری رشتے پاش پاش ہو گئے"____ ان کو پھٹنا تھا وہ پھٹ گئے..... ایک ایسی ہی تحریک ہماری آنکھوں کے سامنے ہے جن ہتھیاروں سے بورژوا نے جاگیرداری نظام کو کاٹ پھینکا وہی ہتھیار اب ان کے خلاف اٹھ چکے ہیں لیکن بورژوا نے صرف ہتھیار ہی نہیں ڈھالے جو اس کی موت کا پیغام ہیں۔ بلکہ ان کے استعمال کرنے والوں کو بھی جنم دیا ہے---- یعنی موجودہ مزدور جماعت یا پرولتاری۔

آگے چل کر پرولتاری کی درماندگی کے اسباب بیان کیے ہیں..... "موجودہ صنعت نے عام چھوٹے چھوٹے کارخانوں کو صنعتی سرمایہ دار کی بڑی بڑی فیکٹریوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ مزدوروں کے جھنڈ جو فیکٹریوں میں گھسے ہوئے ہیں سپاہیوں کی طرح ترتیب دیئے جاتے ہیں۔ صنعتی فوجوں کے سپاہیوں کی طرح وہ افسروں اور سارجنٹوں کی ماتحتی میں رکھے جاتے ہیں۔ وہ صرف بورژوا جماعت اور بورژوا سلطنت ہی کے غلام نہیں ہوتے بلکہ ہر روز اور ہر لمحہ مشین' نگرانی کرنے والے اور سب سے بڑھ کر بورژوا کاریگر انہیں غلام بناتے رہتے ہیں۔ پھر جس قدر کھلے بندوں یہ مطلق العنانی اپنے مقاصد ظاہر کرتی ہے۔ اسی قدر حقیر اور قابل نفرت ہو جاتی ہے۔"

اس کے بعد اعلان جماعتی لڑائی کے بڑھنے کا انداز بتاتا ہے' پرولتاری نشوونما کے مختلف دوروں سے گزرتا ہے۔ پیدائش کے ساتھ ہی بورژوا سے اس کی ٹھن جاتی ہے۔ شروع شروع میں مقابلہ اکے دکے مزدور کرتے ہیں پھر ایک فیکٹری کے سارے مزدور مل کر اس کے بعد ایک مقام پر ایک تجارت کے مزدور کسی ایک بورژوا کے

خلاف جو انہیں لوٹ رہا ہے اٹھتے ہیں اور اپنے حملوں کا رخ بورژوا کی پیداوار کے ذرائع اور آلوں کی طرف کر دیتے ہیں اس مقام پر بھی مزدور فضا میں بکھرے ہوئے بے ربط ذروں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ باہمی مقابلہ نے انہیں توڑ دیا ہوتا ہے۔ اور اگر کہیں وہ ٹھوس جسم لے لیتے ہیں۔ تو یہ ان کے اتفاق کا نہیں بلکہ بورژوا کے اتحاد کا نتیجہ ہے۔ جو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے سارے پرولتاریوں کو اکسانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور وقتی طور پر ایسا کر گزرتے ہیں' مزدور اور بورژوا کے خلاف سنگھٹن کرنے لگتے ہیں۔ اجرت کی شرح قائم رکھنے کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں۔ ایسی اتفاقی بغاوتوں کے لیے پہلے سے بندوبست کرنے کی خاطر مستقل سبھائیں قائم کرتے ہیں۔ کہیں کہیں مقابلہ بغاوت کا روپ لے لیتا ہے کبھی کبھی مزدور جیت جاتے ہیں۔ اگرچہ وقتی طور پر۔ لیکن ان کی لڑائیوں کا حقیقی ثمر فوری نتیجہ میں نہیں۔ بلکہ روز بروز بڑھتے ہوئے سنگھٹن میں ہے۔ اس سنگھٹن کو رسل و رسائل کے نئے ذریعوں سے بہت مدد ملی ہے جنہیں جدید صنعت نے جنم دیا ہے اور جو مختلف مقاموں کے مزدوروں کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ جماعتوں میں متعدد مقامی لڑائیوں کو ایک قومی لڑائی کا رنگ دینے کے لیے اس وابستگی کی ضرورت تھی۔ لیکن ہر جماعتی لڑائی سیاسی لڑائی ہے۔ اور وہ سنگھٹن جس کے لیے وسطی دور میں خستہ شاہراہوں کے باعث صدیاں درکار تھیں۔ موجودہ پرولتاری ریلوں کی برکت سے چند ہی سالوں میں حاصل کر لیتے ہیں۔ پرولتاریوں کی ایک جماعت اور اس کے بعد سیاسی پارٹی بننے کو ان کے باہمی مقابلہ سے لگاتار دھکا لگتا رہتا ہے۔ لیکن وہ پھر اٹھتے ہیں اور اب پہلے سے زیادہ مضبوط پکے اور قوی ہو کر اور آخر بورژوا کے باہمی نفاق سے فائدہ اٹھا کر اسمبلیوں میں مزدور کے خاص مفاد کو تسلیم کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں.....

پرولتاری حالات کو سامنے رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ قدیم سوسائٹی کی کوئی بات باقی نہیں رہی۔ پرولتاری کی کوئی جائیداد نہیں۔ اس کے بیوی بچوں سے تعلقات بورژوا

خانگی تعلقات سے بالکل جدا ہیں- جدید صنعتی محنت اور سرمایہ کے آگے سجدے- انگلینڈ' فرانس' امریکہ اور جرمنی میں ایک ہی انداز لیے ہوئے ہیں- اور اس کی قومی شخصیت کا آخری قطرہ تک چوس چکے ہیں- قانون' اخلاق اور مذہب اسے بورژوا کی کھڑی کی گئی آڑیں معلوم دیتی ہیں- جن کے پیچھے بورژوا مفاد کے لشکر گھات لگائے بیٹھے ہیں- پہلی تمام جماعتوں نے غالب آنے پر اپنے معیار کو مضبوط کرنے کی کوشش کی- اور دوسری سوسائٹی کو اپنی آسائش کی بھینٹ چڑھا دیا- پرولتاری کبھی سوسائٹی کی پیدا کرنے والی قوتوں کے مالک نہیں بن سکتے- جب تک وہ خدمت کیشی کے پہلے طریقے کو نہیں چھوڑیں گے- ان کے پاس اپنا کچھ نہیں جس کی وہ حفاظت چاہتے ہیں- ان کا کام ذاتی ملکیتوں کی تمام حفاظتوں اور بچاؤ کو تباہ کر دینا ہے- تمام گزشتہ تاریخی تحریکیں اقلیت کی تحریکیں تھیں یا اقلیت کے مفاد کی خاطر تھیں- پرولتاری تحریک اکثریت کی تحریک ہے- اور اکثریت کے مفاد کے لیے ہے- پرولتاری---- موجودہ سوسائٹی کا پست ترین طبقہ حرکت میں نہیں آ سکتا اور اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا- جب تک عہدہ دارانہ سوسائٹی کے پرچم کی دھجیاں نہیں اڑا دی جاتیں-

مارکس کہتا ہے کہ "کمیونسٹ پرولتاریوں کی ترجمانی کرتے ہیں- وہ بین الاقوامی ہیں- ان پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ ملکوں اور قومیتوں کو مٹانے والے ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ مزدور کا کوئی ملک نہیں- پھر جس کا کچھ بھی نہیں اس سے کیا چھینا جا سکتا ہے" کمیونسٹ کا فوری مدعا پرولتاری کی سیاسی قوت کی فتح ہے کمیونسٹوں کا اصول ایک جملہ میں ادا ہو سکتا ہے---- ذاتی ملکیت کا خاتمہ-

تاریخ کے مادی نکتہ نگاہ میں ان الزامات کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ کمیونزم عیسائیت کے خلاف ہے- "کمیونزم کے خلاف مذہبی' فلسفیانہ اور عام طور پر اصولی نقطہ سے لگائے گئے بہتان ایسے نہیں ہیں کہ ان پر سر کھپائی کی جائے- کیا یہ سمجھنے کے لیے کسی گہرے مطالعہ کی ضرورت ہے- کہ انسان کے خیالات اور

تصورات ـــــ ایک لفظ میں انسان کی سمجھ اس کے سماجی تعلقات اور سماجی زندگی میں مادی تبدیلیوں کے ساتھ بدل جاتی ہے۔" حکومت کے متعلق اعلان کا رویہ سمجھنا آسان نہیں ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ "موجودہ حکومت کے کرتے دھرتے کیا ہیں؟ تمام بورژوا کے مشترکہ کاموں کے انتظام کرنے والے ہیں۔ تاہم پرولتاری کا پہلا قدم یہی ہے کہ حکومت پر قابو پالے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مزدور جماعت کے انقلاب میں پہلا قدم پرولتاری کو حاکم کے درجہ تک اٹھا لے جانا اور جمہوریت کی لڑائی جیتنا ہے پرولتاری اپنی سیاسی برتری کو رفتہ رفتہ بورژوا سے تمام سرمایہ لے لینے اور پیداوار کے تمام آلات کو ریاست کے ہاتھ میں (جو پرولتاری کی حکومت ہوگی' دے دینے اور جتنی جلدی ممکن ہو پیدا کرنے والی قوتوں کا میزان بڑھانے میں استعمال کریں گے۔"

اس کے بعد اعلان اصلاح کے فوری پروگرام پر پہنچ جاتا ہے۔ جو پہلے تو حکومت کی طاقت کو بڑھا دے گا لیکن (اس کا دعویٰ ہے کہ) جب سوشلسٹ انقلاب مکمل ہو جائے گا۔ تو حکومت اپنے موجودہ معنوں میں ختم ہو جائے گی۔ جیسا کہا اینگلز کسی جگہ کہتا ہے۔ جب پرولتاری سلطنت پر قابض ہو جائیں گے۔ تو جماعت کے تمام اختلافات اور مخالفیں مٹ جائیں گے اور ریاست بحیثیت ریاست کے نہ رہے گی۔ اس طرح گو سٹیٹ سوشلزم مارکس اور اینگلز کی تجویزوں کا نتیجہ بن جائے۔ لیکن ریاست کو فروغ دینے کا الزام ان پر نہیں لگایا جا سکتا۔

اعلان کے خاتمہ پر دنیا کے مزدوروں کو کمیونزم کے حق میں اٹھنے کی اپیل کی گئی ہے۔ کمیونسٹ اپنے خیالات اور ارادے چھپانے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کھلے بندوں کہتے ہیں۔ کہ ان کی آرزوئیں تمام موجودہ حالات کو بزور پھینک دینے ہی سے پوری ہو سکتی ہیں۔ پھر اشتراکی انقلاب پر حکمران جماعتیں کانپتی ہیں تو کانپیں۔ پرولتاری اپنی زنجیروں کے سوا کچھ نہیں کھوئے گا۔ اور ایک دنیا اس کے جیتنے کے لیے ہے..... "دنیا کے مزدورو ایک ہو جاؤ۔"

روس کو چھوڑ کر یورپ کے تمام بڑے ملکوں میں اشتراکی اعلان کی اشاعت کے فوراً بعد ہی انقلاب پھوٹ پڑا۔ لیکن یہ انقلاب فرانس کے ابتدائی دور کو چھوڑ کر کہیں بھی اقتصادی یا بین الاقوامی نہیں تھا۔ ہر جگہ قومیت کے خیالات نے اسے اکسایا تھا۔ چنانچہ دنیا کے حکمران وقتی طور پر گھبرا جانے کے بعد ان دشمنیوں کو پانی دے کر جو قومی خیالات میں چھپی ہوتی ہیں۔ پھر قوت پکڑ گئے اور مختصر سی فتح کے بعد انقلاب جنگ اور رجعت پسندی میں ختم ہو گیا۔ اشتراکی اعلان کے خیالات گو قبل ازوقت تھے لیکن اس کے مصنف ہر ملک میں اس سوشلسٹ تحریک کے بڑھنے کا آغاز دیکھنے تک زندہ رہے جس نے بڑھتی ہوئی قوت کے ساتھ اپنا اثر دکھایا اور حکومتوں کو زیادہ سے زیادہ متاثر کیا۔ روسی انقلاب پر یہ تحریک چھا گئی اور وہ دن دور نہیں کہ اسے وہ بین الاقوامی فتح نصیب ہو جائے جس کے لیے اعلان کے آخری جملے دنیا کے مزدوروں کو پکارتے ہیں۔

مارکس کے "سرمایہ" نے اشتراکی اعلان کے مضمون میں نئی روح پھونک دی۔ اس نے قدر زائد کا نظریہ پیش کیا۔جو سرمایہ داری لوٹ کھسوٹ کا پول کھولنے والا ہے۔ یہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔ اسے مارکس کی اس نفرت کا پرتو کہا جا سکتا ہے۔ جو اسے اس نظام سے تھی جس میں انسانی زندگیوں سے دولت چوسی جاتی ہے۔ قدر زائد کے مسئلہ کا گہرا تجزیہ خالص معاشی نظریوں کی ٹھوس اور کٹھن بحث چاہتا ہے۔ جس کا سوشلزم کے عملی جھوٹ اور سچ سے کچھ بھی واسطہ نہیں۔ "سرمایہ" کے بہتریں حصے وہ ہیں۔ جو ان اقتصادی واقعات سے بحث کرتے ہیں۔ جن کا مارکس کو انسائیکلوپیڈیائی علم تھا۔ انہیں واقعات کے ذریعے وہ اپنے شاگردوں میں پکی اور نہ مرنے والی نفرت بھر دینے کی امید رکھتا تھا۔ جو انہیں جماعتی جنگ میں عمر بھر سپاہی بنائے رکھے جو واقعات وہ اکٹھے کرتا ہے۔ ایسے ہیں جن کا عملی طور پر باآرام زندگی بسر کرنے والوں کو علم نہیں وہ بڑے بھیانک واقعات ہیں اور جو اقتصادی نظام ان کو جنم دیتا ہے۔ اسے بھیانک نظام

کہنا پڑتا ہے۔ واقعات کی چند مثالیں اکثر سوشلسٹوں کی ترسی کی تفسیر کر دیں گی: 1-
مسٹر برٹن چارلٹن علاقہ مجسٹریٹ نے 16 جنوری 1860ء کو ناٹنگھم اسمبلی ہال میں صدر
کی حیثیت سے واضح کیا گیا ہے کہ گوٹا کناری کی تجارت سے متعلق آبادی میں بھوک
اور دکھ کی وہ وہ مثالیں ہیں کہ سلطنت کے دوسرے حصوں میں کم ہوں گی۔ اور
مہذب دنیا میں ان کا خیال تک نہیں ہو سکتا..... نو دس سال کے بچے صبح دو تین یا چار
بجے کے قریب اپنے میلے کچیلے بستروں سے کھینچے جاتے ہیں اور محض روٹی پر دس گیارہ
بلکہ بارہ بجے رات تک کام پر مجبور کیے جاتے ہیں۔ ان کے اعضا تھکے جاتے ہیں۔ جسم
گھلے جاتے ہیں۔ چہرے سفید ہو رہے ہیں۔ اور ان کی انسانیت ایک پتھریلی بے حسی
میں ڈوبی جا رہی ہے۔ جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ (جلد اول' ص 227)

تین ریلوے ملازم (گارڈ' ڈرائیور' سگنل والا) لندن کے ناگہانی موت کی تحقیق
کرنے والوں کی جیوری کے سامنے کھڑے ہیں۔ ریل کے ایک زبردست حادثہ نے
سینکڑوں مسافروں کو دوسری دنیا میں پہنچا دیا ہے۔ اس بدبختی کا باعث ملازموں کی غفلت
ہے ان کا بیان ہے کہ دس یا بارہ سال پہلے ان کی محنت صرف آٹھ گھنٹے روزانہ ہوا
کرتی تھی۔ پچھلے پانچ چھ سال سے وہ چودہ اٹھارہ اور بیس گھنٹے ہو گئی ہے۔ بلکہ چھٹیاں
منانے والوں کے ہجوم کے باعث اور تفریحی گاڑیوں کے وقت لگاتار چالیس یا پچاس
گھنٹے بھی رہی ہے۔ وہ عام آدمی تھے۔ بھوت نہیں تھے۔ ایک وقت ان کی محنت کی
قوت جواب دے گئی۔ بے حسی چھا گئی۔ دماغ سوچنے سے رہ گیا اور آنکھیں دیکھنے
سے۔ لیکن معزز برطانوی ثالثوں نے فیصلہ دے کر قتل انسانی کے جرم میں انہیں
دوسری عدالت میں بھیج دیا اور یہ مقدس امید ظاہر کی کہ ریلوے کے سرمایہ دار شرفا
آئندہ محنتی قوت کی کافی مقدار خریدنے میں دریغ نہیں کریں گے۔ اور اس کے خرچ
کرنے میں زیادہ کفایت ایثار اور احتیاط سے کام لیں گے۔ (جلد اول' ص 38-237)

جون 1865ء کے آخری ہفتہ میں لندن کے تمام روزانہ اخباروں میں سنسنی پیدا

کرنے والے عنوان کے ساتھ ایک خبر شائع ہوئی۔ "محض زیادہ کام کرنے سے موت۔" اس میں عورتوں کی ٹوپیاں بنانے والی ایک بیس سالہ لڑکی۔ "میری اینے و یکلی" کی موت کا ذکر تھا۔ جو لباس سازوں کی ایک باعزت فرم میں ملازم تھی اور 'ایلیزا' کے سہانے نام والی ایک خاتون کے ہاتھوں لوٹی جا رہی تھی۔ یہ لڑکی اوسطاً" ساڑھے سولہ گھنٹے اور کاروباری دنوں میں اکثر تیس گھنٹے مسلسل کام کیا کرتی۔ چائے اور قہوہ وغیرہ کا استعمال اس کی گرتی ہوئی قوت کار کو سہارا دیئے جاتا۔ اب موسم عروج پر تھا اور آنکھ جھپکنے میں ان امیر زادیوں کے شاندار لباس تیار کرنے نہایت ضروری تھے جنہیں نئی شہزادی ویلز کی آمد پر رقص کی اجازت ملی تھی۔ میری اینے و یکلی' نے لگاتار ساڑھے چھبیس گھنٹے کام کیا۔ اس کے ساتھ ساٹھ لڑکیاں اور بھی تھیں۔ جن میں سے تیس ایک کمرے میں تھی اور اس طرح 1/3 مکعب فٹ ہوا سب کو ملتی۔ رات کو وہ دو دو ہو کر ان تنگ سرنگوں میں پڑ رہتیں جن میں تختوں کے ذریعے سونے کا کمرہ' تقسیم کیا ہوا تھا اور یہ لندن کا ٹوپیوں کا بہترین کارخانہ تھا۔ میری اینے و یکلی جمعہ کو بیمار پڑی۔ اتوار کو مر گئی اور میری ایلیزا کی حیرت کے لیے اپنا کام بھی ختم نہ کر سکی۔ ڈاکٹر بستر مرگ پر پہنچا اور جیوری کے آگے بیان دیا کہ میری اینے و یکلی کی موت کھچا کھچ بھرے ہوئے کمرے میں زیادہ کام کرنے اور تنگ و تاریک کمرے میں سونے کے باعث ہوئی ہے' لیکن ڈاکٹر کو اچھا سبق دینے کے لیے جیوری نے فیصلہ دیا۔ کہ مرنے والی مرگی سے مر گئی ہے۔ لیکن یہ اندیشہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کی موت کو کھچا کھچ کمرے اور زیادہ کام کرنے نے جلد کر دیا ہو۔ "مارننگ سٹار" اس پر چلایا۔ "ہمارے سفید غلام—— ہمارے سفید غلام جو محنتیں کرتے کرتے قبر تک پہنچ جاتے ہیں زیادہ تر خاموش کڑھتے کڑھتے مر جاتے ہیں۔" (جلد اول' ص 40-239)

1547ء میں ایڈورڈ ششم کا ایک قانون واضح کرتا ہے۔ کہ اگر کوئی کام کرنے سے انکار کرے گا۔ تو اسے اس کا غلام بنا دیا جائے گا۔ جس نے اسے بیکار کا لقب دیا ہو گا۔

آقا اپنے غلام کو روٹی اور پانی' ہلکا شوربا- بچا کھچا گوشت جو وہ مناسب سمجھے گا دے گا اسے حق ہے کہ کوڑوں اور زنجیروں سے اسے کسی کام کے لیے مجبور کرے- وہ کام کتنا ذلیل ہی کیوں نہ ہو- اگر غلام دو ہفتہ تک غائب رہے- تو اسے عمر بھر غلام کر دیا جائے گا اس کے ماتھے یا پشت پر 'غ' کا حرف داغ دیا جائے گا- اگر وہ پھر بھاگ جائے گا- تو سخت مجرم کی حیثیت سے اس کے ساتھ سلوک کیا جائے گا- آقا اسے بیچ سکتا ہے- اگر غلام آقاؤں کے خلاف کوئی قدم اٹھائیں گے- تو ان سے قانونی سلوک کیا جائے گا- امن کے علم برداروں کو چاہیے کہ اطلاع ملنے پر ایسے بدمعاشوں کا پیچھا کریں- اگر کوئی بدمعاش تین دن تک بیکار رہتا ہے تو اسے اس کی جنم بھومی پر لے جا کر گرم لوہے سے اس کی چھاتی پر 'ب' کا حرف داغ دیا جائے اور زنجیروں میں جکڑ کر گلی کوچوں میں کام کرنے پر مجبور کیا جائے- اگر وہ غلط جنم بھومی بتائے تو اسے عمر بھر کے لیے اس جگہ کا اس کے باشندوں یا جماعت کا غلام بنا دیا جائے- اور صرف 'غ' داغ دیا جائے- تمام لوگوں کو حق ہے کہ ان بدمعاشوں کے بچے لے جائیں اور لڑکوں کو 24 سال تک اور لڑکیوں کو 20 سال تک شاگرد رکھیں- اگر وہ بھاگ جائیں تو ساری عمر اپنے آقاؤں کے غلام سمجھے جائیں گے- جو انہیں زنجیروں میں جکڑ سکتے ہیں- کوڑوں سے پیٹ سکتے ہیں- ہر آقا کو اجازت ہے کہ ان کے گلے بازو یا ٹانگوں میں لوہے کا کڑا ڈال دے- تاکہ پہچاننے میں آسانی ہو- اس قانون کا آخری حصہ بتاتا ہے کہ بعض غریب لوگوں کو ایسے لوگ ملازم رکھ سکتے ہیں- جو ان کو روٹی پانی دینے پر رضامند ہوں- اور ان کے لیے کام تلاش کریں- اس قسم کے غلام انگلینڈ میں انیسویں صدی تک (Roundsmen) کے نام سے رکھے جاتے تھے (جلد اول' ص 9-758)

صفحوں کے صفحے اور بابوں کے باب اس قسم کے واقعات جو کسی خطرناک تھیوری کو ظاہر کرتے ہیں- اور جنہیں مارکس نے عقل سے ثابت کیے ہوئے بیان کیا ہے- مزدور جماعت کے مطالعہ کرنے والے جوشیلوں کو آگ بگولا اور اس سرمایہ دار کو جس کا

دل انصاف اور کشادہ دلی کا مزار نہیں بن چکا شرم سے پسینہ پسینہ کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

کتاب کے انجام پر ایک مختصر سے باب میں مارکس امید کی ایک کرن چھننے دیتا ہے جو موجودہ کپکپی کے پیچھے چھپی ہوئی ہے۔ جس وقت کایا پلٹ کا سلسلہ پرانی سوسائٹی کو سر سے پاؤں تک کافی پارہ پارہ کر چکا ہوگا۔ مزدور پرولتاری بن گئے ہوں گے۔ ان کی محنت کے ذرائع سرمایہ میں تبدیل ہو جائیں گے۔ پیداوار کا سرمایہ داری طریقہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گا۔ محنت کو زیادہ مشترک کرنا اور زمین اور دوسرے پیداواری ذریعوں کی کایا پلٹ اور پرائیویٹ مالکوں کی بے تعلقی نیا روپ لے لے گی۔ اب جسے بے تعلق کرنا ہو گا۔ وہ اپنے پیٹ کے لیے محنت کرنے والا مزدور نہیں۔ بلکہ لاکھوں مزدوروں کا خون چوسنے والا سرمایہ دار ہو گا یہ بے تعلقی سرمایہ داری پیداوار کے طبعی قانوں سے سرمایہ کو ایک مرکز پر لے آنے سے خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک سرمایہ دار ہمیشہ دوسروں کو مار دیتا ہے۔ اس مرکزیت یا بہت سے سرمایہ داروں کو چند سرمایہ داروں کے بے تعلق کر دینے کے ساتھ ساتھ بڑھتے ہوئے پیمانہ پر مزدور تحریک کی باہمی امداد۔ سائنس کا ٹیکنیکل استعمال۔ زمین کی طریقے کے ساتھ کاشت۔ محنت کے اوزاروں کا اشتراک۔ پیداوار کے ذرائع کا مالی لحاظ سے ساجھ پن۔ سماج داری محنت' دنیا کی منڈی میں سب کا تعاون اور اس کے ساتھ سرمایہ داری نظام کی بین الاقوامی شخصیت بڑھتی ہے۔ پونجی پتیوں کی روز بروز گھٹتی ہوئی تعداد کے ساتھ جو اس کایا پلٹ کے سلسلہ کے تمام فائدوں پر چھاپہ مارنا چاہتے ہیں نحوست' دباؤ' غلامی' پستی اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی مزدور جماعت کی بغاوت سر اٹھاتی ہے۔ جو ہمیشہ تعداد میں بڑھتی منظم ہوتی۔ ایک ہوتی اور سرمایہ داری پیداوار کے دستور میں خود بخود منظم ہو جاتی ہے۔ سرمایہ کی اجارہ داری پیداوار کے طریقے کے لیے وبال بن جاتی ہے جو اس کے سایہ میں اور ساتھ ساتھ پھولا پھلا ہوتا ہے۔ پیداوار کے ذریعوں کو ایک مرکز پر

لانے اور محنت کو سماج داری کرنے کی کوششیں آخر ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتی ہیں۔ جہاں وہ سرمایہ داری حجاب سے موافقت نہیں کر سکتیں۔ یہ حجاب چاک کر دیا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ ذاتی ملکیت کی ماتمی گھنٹی بجنے لگتی ہے۔ بے تعلق کرنے والے بے تعلق کر دیئے جاتے ہیں۔ (جلد اول، ص 9-788)

شروع سے آخر تک بمشکل ہی کوئی اور لفظ اداسی کو دور کرنے والا ہے اور کتاب کے پڑھنے والے پر افسوں اسی سخت دباؤ کے سبب ہے۔

مارکس کی تصنیفوں نے دو سوال پیدا کر دیئے ہیں۔ پہلا یہ کہ کیا اس کے تاریخی نشوونما کے قانون درست ہیں؟ دوسرا کیا سوشلزم پسندیدہ ہے؟ دوسرے سوال کا پہلے سے کوئی تعلق نہیں۔ مارکس ثابت کرنے کا دعویٰ کرتا ہے کہ سوشلزم آ کر رہے گی۔ لیکن کہیں بھی اس پر بحث نہیں کرتا۔ کہ جب وہ آئے گی مفید ہو گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی آمد کے متعلق مارکس کی سب دلیلیں غلط نکلیں۔ اور پھر بھی جب وہ آئے مفید رہے۔ درحقیقت وقت نے مارکس کے نظریہ کی بہت سی خامیاں ظاہر کر دی ہیں۔ یہ درست ہے کہ دنیا کی رفتار بہت کچھ اس کے کہنے کے مطابق رہی ہے اور ہم اسے غیر معمولی دور اندیش کہہ سکتے ہیں۔ لیکن وہ ہو بہو ایسی نہیں ہے کہ سیاسی یا اقتصادی طور پر تاریخ کو وہ کچھ کر دیتی۔ جس کی اس نے پیش گوئی کی تھی۔ قومیت کم ہونے کی نسبت اور بڑھ گئی ہے۔ اور ان رجحانات سے دب نہیں سکی۔ جن کا مارکس نے مالیات میں بجا طور پر ذکر کیا۔ ہرچند بڑے بڑے کاروبار مزید بڑے ہونے لگ گئے ہیں اور ایک بڑے رقبے پر اجارہ داری تک پہنچ گئے ہیں۔ تاہم حصہ داروں کی تعداد ایسے کاموں میں اتنی زیادہ ہے کہ سرمایہ داری نظام میں دلچسپی رکھنے والے لوگوں کی تعداد مسلسل بڑھتی گئی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر اگرچہ بڑی بڑی فرمیں مزید بڑی ہو گئی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی عام سائز کی فرموں میں بھی ترقی ہوئی ہے اور مزدور (جو مارکس کے مطابق اسی قدر 'بقدر زکواۃ' لے کر گزارہ کرتے رہیں گے۔ جس قدر

انیسویں صدی کے نصف اول میں وہ انگلینڈ میں لیتے تھے) دولت کی عام فراوانی سے بہرہ مند ہوئے ہیں (اگرچہ سرمایہ داروں کی نسبت کم مقدار میں) اجرت کا فرض کیا گیا قانون جہاں تک مہذب ملکوں میں محنت کا تعلق ہے۔ نادرست نکلا ہے۔ اگر آج ہم سرمایہ داروں کے ان ظلموں کی مثالیں ڈھونڈنا چاہتے ہیں۔ جن سے مارکس کی کتاب بھری پڑی ہے تو ہمیں زیادہ مواد کے لیے منطقوں کا رخ کرنا پڑے گا۔ یا ان طبقوں کی طرف جہاں لوٹنے کے لیے ابھی پست نسلوں کے انسان موجود ہیں۔ آج کا ماہر مزدور محنت کی دنیا کا بادشاہ ہے۔ یہ اس کی مرضی ہے کہ سرمایہ کے خلاف اناڑی مزدوروں کا ساتھ دے۔ یا ان اناڑیوں کے خلاف سرمایہ دار کا۔ عام طور پر وہ خود بھی چھوٹے پیمانے پر سرمایہ دار ہوتا ہے! اور اگر وہ ذاتی طور پر ایسا نہ بھی ہو تو بھی اس کی ٹریڈ یونین یا دوستانہ سوسائٹی کا ایسا ہونا بہت ممکن ہے۔ غرض جماعتی لڑائی میں وہ تیزی نہیں رہی ہے۔ امیر اور غریب۔ مزدور (جس کے پاس کچھ نہیں) اور سرمایہ دار "جس کے پاس سب کچھ ہے) کے درمیان سیدھے سادے منطقی تضاد کے برعکس زینے اور وسطی درجے ہیں۔ جرمنی میں بھی جو پکی مارکسیت کا گھر بن گیا تھا اور جہاں زبردست سوشل ڈیموکریٹک پارٹی قائم ہوئی۔ وہاں بھی جنگ کے بعد تمام جماعتوں میں دولت کی زیادتی نے سوشلسٹوں کو اپنے اعتقادات پر نظر ثانی کرنے اور انقلابی رویہ کی جگہ ارتقائی رویہ اختیار کرنے پر ابھارا۔ برنسٹن ایک جرمن سوشلسٹ نے جو بہت دیر تک انگلینڈ میں رہا۔ (Revisionist) تحریک جاری کی جس نے آخر کار پارٹی کے اکثر حصے کو اپنی طرف کر لیا۔ پکی مارکسزم پر اس کی تنقیدیں ارتقائی سوشلزم میں لکھی ہوئی ہیں۔ برنسٹن کی تصنیف جیسا کہ آزاد خیال مصنفوں میں عام ہے۔ زیادہ تر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ ایجاد کرنے والے اپنے نظریوں پر اتنے سخت نہیں ہوتے جتنے ان کی پیروی کرنے والے۔ مارکس اور اینگلز کی اکثر باتیں اس پختہ یقینی کو برداشت نہیں کر سکتیں جو پیرووں میں پیدا ہو گئیں۔ برنسٹن کے ان چیلوں پر زیادہ تنقیدیں (ان

کے علاوہ جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں) انقلاب کے برعکس تھوڑے تھوڑے عمل پر زور دیتی ہیں۔ وہ برلزم کے خلاف ناروا دشمنی کو نہیں سراہتا جو سوشلسٹوں میں بہت عام ہے۔ وہ اس بین الاقوامی دھار کو کند کرتا ہے۔ جو بلاشبہ مارکسی تعلیم کا ایک حصہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مزدوروں کی بھی ایک مادر وطن ہوا کرتی ہے اور اسی بنا پر وہ اس نیشلزم کی حمایت کرتا ہے۔ جو جنگ کے دوران میں سوشلسٹ حلقوں میں ظاہر ہوئی ہے۔ وہ یہاں تک کہہ دیتا ہے کہ اعلیٰ تہذیب کے باعث یورپی نسلوں کو منطقی مقبوضات کا حق ہے۔ ایسی باتیں انقلابی چاشنی کم کر دیتی ہیں اور سوشلسٹوں کو محض لبرل پارٹی کا گرم دل بنا دیتی ہیں لیکن جنگ سے پہلے مزدوروں میں بڑھتی ہوئی فراغت نے یہ سب کچھ اٹل کر دیا ہے اور ابھی یہ قیاس کرنا ناممکن ہے کہ جنگ انہیں بدل دے گی۔ برنسٹن ایک پتے کی بات کہتا ہے کہ "ہمیں مزدوروں کو ان کی عام حالت میں لینا چاہیے۔ وہ بالکل گئے گزرے بھی نہیں ہیں جیسا کہ اشتراکی اعلان میں مذکور ہے اور نہ تعصب اور کمزوریوں سے اس قدر پاک ہیں۔ جس قدر ان کے مالک ہمیں منوانا چاہتے ہیں۔"

برنسٹن مارکسی پختہ اعتقادی کے تنے میں ایک گھن اور سنڈیکلزم جو مارکس اور اینگلز سے کہیں بڑھ کر انقلابی اور ریڈیکل ہونے کی دعویدار ہے۔ اس کے سر پر کلھاڑے کی چوٹ ہے۔ مارکس کے متعلق سنڈیکلسٹوں کا رویہ سوال کی چھوٹی سی کتاب "مارکسیت کا زوال" اور اس سے بڑی تصنیف "تشدد پر نظر" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مارکس پر تنقید کرتے ہوئے برنسٹن کا حوالہ دے کر سورل کہتا ہے کہ مارکس کی اقتصادی تھیوری مانچسٹرم کے بہت قریب ہے۔ وہ پکی سیاسی اکانومی جسے اس نے جوانی میں قبول کیا تھا۔ آج اکثر باتوں میں غلط ہو رہی ہے۔ سورل کے مطابق مارکس کی تعلیم میں اہم چیز جماعتی لڑائی ہے۔ جو اسے زندہ رکھتا ہے۔ وہ سوشلزم کی روح کو زندہ رکھتا ہے اور سوشل ڈیموکریٹک پختہ اعتقادی کے الفاظ پر سر دھنئے والوں سے کہیں زیادہ

صحیح طور پر جماعتی لڑائی کی بنا پر فرانسیسی سنڈیکلسٹوں نے مارکس پر جو تنقید کی ہے وہ ان سب سے دور نکل جاتی ہے۔ جن پر ہم بحث کر رہے ہیں۔ تاریخی نشوونما کے متعلق مارکس کے خیالات ممکن ہیں کم و بیش غلط ہوں پھر بھی جو سیاسی اور اقتصادی نظام اس نے پیدا کرنے کی کوشش کی وہ ممکن ہے۔ اسی قدر پسندیدہ ہو جس قدر اس کے پیرو سمجھتے ہیں۔ سنڈیکلزم بہرحال نہ صرف واقعات کے متعلق مارکس کی نگاہ پر نکتہ چینی کرتی ہے۔ بلکہ اس منزل پر بھی جدھر وہ جانا چاہتا ہے اور ان طریقوں پر بھی جن کی وہ سفارش کرتا ہے۔ مارکس کے خیالات اس وقت بنے تھے۔ جب ابھی جمہوریت کا وجود نہیں تھا۔ سرمایہ کی تصنیف کے سال میں کہیں انگلینڈ میں پہلی بار شہری مزدور کو ووٹ دینے کا حق ملا اور شمالی جرمنی میں .بسمارک نے عام رائے دہی کا اعلان کر دیا۔ یہ قدرتی امر تھا۔ کہ جمہوریت پر بہت لمبی چوڑی امیدیں قائم کی جاتیں۔ مارکس نے پکے اقتصادی کی طرح خیال کیا کہ لوگوں کی رائیں کم و بیش مالی خود غرضی یا جماعتی مفاد کے روشن خیال نظریہ کے ماتحت ہوتی ہیں۔ سیاسی جمہوریت کے کارناموں کے لمبے چوڑے تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ اس لحاظ سے ڈسرائیلی اور .بسمارک برلوں یا سوشلسٹوں سے کہیں زیادہ فطرت انسانی کے پہچاننے والے تھے حکومت کو آزادی کا ذریعہ سمجھنا یا سیاسی پارٹیوں کو اس قابل سمجھنا کہ وہ حکومت کو لوگوں کی بھلائی پر مجبور کر دے گی۔ آج دشوار ہوتا جا رہا ہے۔ "موجودہ حکومت" سورل لکھتا ہے "ذہین لوگوں کی ایک جماعت ہے۔ جنہیں حقوق ملے ہوئے ہیں اور جن کے پاس ان دوسرے ذہین گروہوں کے حملوں کو روکنے کے لیے سیاسی ذرائع ہوتے ہیں جو پبلک کے کاروبار سے فائدہ اٹھانے کے لیے بیتاب ہوتے ہیں۔ پارٹیاں ان کے کاروباروں پر فتح حاصل کرنے کے لیے بنتی ہیں اور وہ حکومت ہی کا سوانگ بھر لیتی ہیں۔"

سنڈیکلسٹ لوگوں کو پارٹیوں کے لحاظ سے نہیں پیشوں کے لحاظ سے ترتیب

دینا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ جماعتی لڑائی کا تصور اور طریقہ صرف یہی ہے۔ اور وہ پارلیمنٹ اور چناؤ کے ذریعے سیاسی اقدام کے خلاف ہیں۔ وہ صرف انقلابی سنڈیکیٹ یا تجارت سنگ کے براہ راست عمل کی سفارش کرتے ہیں۔ صنعتی اور سیاسی عمل کے درمیان جنگی نوبت کی آواز فرانسیسی سنڈیکلزم کے لشکروں سے کہیں دور باہر پہنچ چکی ہے امریکہ کی IW.W اور برطانیہ کی گلڈ سوشلزم اور صنعتی سنگوں میں اس کی گونج سنائی دے رہی ہے اور جو اس کے دعویدار ہیں ان کی منزل بھی مارکس سے جدا ہے۔ ان کا یقین ہے کہ حکومت کے ہاتھوں میں سب طاقت آ جانے سے وہ سوشلسٹ حکومت ہی کیوں نہ ہو شخصی آزادی ممکن نہیں ہے۔ ان میں سے بعض سولہ آنے انارکسٹ ہیں جو سلطنت کو بالکل اڑا دینا چاہتے ہیں اور بعض اس کے اختیارات گھٹا دینا چاہتے ہیں۔ اس تحریک کے باعث مارکس کی مخالفت جس کی ابتدا انارکسٹ گروہ سے ہوئی قوت پکڑ چکی ہے۔ دوسرے باب میں مخالفت کے اسی پرانے رنگ پر بحث کی جائے گی۔

دوسرا باب

بکونن اور انارکزم

عام لوگوں کے خیال میں انارکسٹ وہ ہے جو بم پھینکتا اور دوسری بدامنیاں کرتا ہے۔ بعض انارکسٹ ضرور بم پھینکنے پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن اکثر کا یہ خیال نہیں ہے اور مناسب حالات میں بم پھینکنے پر تقریباً ہر خیال کے لوگوں کا یقین ہے۔ مثلاً جن لوگوں نے سروجیوا پر بم پھینکا۔ وہ انارکسٹ نہیں بلکہ نیشنلسٹ تھے۔ اور جو انارکسٹ بم پھینکنے کی حمایت میں ہیں۔ وہ دوسروں سے کسی بات میں مختلف نہیں ہیں۔ البتہ گنتی کے ان چند لوگوں سے جو ٹالسٹائی کا عدم تشدد کا رویہ رکھتے ہیں۔ سوشلسٹوں کی طرح انارکسٹ جماعتی جنگ میں یقین رکھتے ہیں۔ پھر اگر وہ بم استعمال کرتے ہیں تو بالکل اسی طرح جس طرح حکومتیں جنگ کے مقاصد کے لیے بم استعمال کرتی ہیں۔ لیکن انارکسٹ کے بنائے ہوئے ایک بم کے مقابل حکومتیں کئی لاکھ تیار کرتی ہیں۔ اور انارکسٹ تشدد سے مارے ہوئے ایک آدمی کے مقابل حکومتوں کا جبر کئی لاکھ کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ اس لیے ہمیں اپنے داغوں سے تشدد کا سوال ہی نکال دینا چاہیے۔ عام تصور میں اس قدر کارفرما ہے اور پھر یہ انارکسٹ مقام اختیار کرنے والوں کے لیے ہی ضروری اور مخصوص نہیں ہے۔

انارکزم جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے کہ ایک اصول ہے۔ جو ہر طرح کی جبری حکومت کے خلاف ہے۔ یہ حکومت کے خلاف ہے۔ کیونکہ اسے جبر کا مجسمہ سمجھتی ہے۔ جن حکومتوں کو انارکزم برداشت کر سکتی ہے وہ صرف آزاد حکومتیں ہیں۔

لیکن عام معنوں میں آزاد نہیں بلکہ ان معنوں میں کہ اس پر سب خوش ہوں۔ انارکسٹ پولیس اور تعزیری قانون کے اڈوں کے خلاف ہیں۔ جن کے ذریعے جماعت کے ایک گروہ کی مرضی دوسرے پر ٹھونسی جاتی ہے۔ ان کے خیال میں جمہوری طرز حکومت دوسرے طریقوں سے اس وقت تک نہیں جب تک اس میں اقلیت کی زندگی اکثریت کے رحم پر ہے۔ اور اسے اکثریت کے آگے مجبوراً" جھکنا پڑتا ہے۔ انارکزم میں آزادی سب سے بڑی اچھائی ہے اور فرد پر جماعت کے تمام جبری اختیار کو مٹا کر اسی آزادی کی تلاش کی جاتی ہے۔

موجودہ انارکزم کا یہ بنیادی اصول ہے کہ زمین اور سرمایہ پر جماعتی قبضہ ہونا چاہیے۔ اور اس طرح ایک اہم پہلو میں سوشلزم سے موافقت کھاتی ہے یہ نظریہ بجا طور پر انارکسٹ کمیونزم کہلاتا ہے۔ لیکن چونکہ عملاً" اس میں ساری جدید انارکزم آ جاتی ہے۔ اس لیے کوئی حرج نہیں۔ اگر ہم ذاتی انارکزم کو بالکل چھوڑ کر جماعتی شکل پر ساری توجہ دیں۔ سوشلزم اور انارکسزم دونوں نے اس خیال سے جنم لیا ہے کہ ذاتی سرمایہ بعض لوگوں کے بعض پر ظلم کا باعث ہے۔ پکی سوشلزم اس خیال کی ہے کہ اگر حکومت ہی تنہا سرمایہ دار بن جائے۔ تو فرد آزاد ہو جائے گا۔ اس کے برعکس انارکزم ڈرتی ہے کہ اس صورت میں حکومت میں بھی نجی سرمایہ دار کی طرح سی خرابیاں نہ آ جائیں۔ چنانچہ وہ جماعتی ملکیت کی جہاں تک ممکن ہو گھٹائی ہوئی طاقت میں سمجھوتہ کا ذریعہ تلاش کرتی ہے اور آخرکار حکومت کو بالکل مٹا دینا چاہتی ہے۔ سوشلسٹ تحریک میں یہ زیادہ تر انتہا پسند گرم دل کی شکل میں اٹھی ہے۔

جس رنگ میں مارکس کو سوشلزم کا بانی کہا جا سکتا ہے۔ بکونن کو بھی انارکسٹ کمیونزم کا بانی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن مارکس کی طرح بکونن نے کوئی مکمل اور باقاعدہ نظریے پیدا نہیں کیے۔ اس پر اس کے پیرو کروپاٹکن نے اپنی تصنیفوں میں لکھا ہے۔ موجودہ انارکزم کی تشریح کے لیے ہم بکونن کی زندگی اور مارکس کے ساتھ اس

کے الجھاؤ کی تاریخ سے شروع ہوتے ہیں۔ اور پھر انارکسٹ نظریہ کا مختصر حال لکھیں گے جیساکہ اس کی اپنی تصنیفوں لیکن زیادہ تر کروپا ٹکن کی کتابوں میں درج ہے۔

مائیکل بکونن 1814ء میں روس کے ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ بکونن کی پیدائش کے وقت ریٹائر ہو کر ریاست ٹور میں اپنی جاگیر پر چلا گیا تھا بکونن پیٹرز برگ میں پندرہ سال کی عمر میں فوجی سکول میں داخل ہوا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ایک رجمنٹ کا افسر ہو کر سنک میں بھیج دیا گیا۔ 1830ء کی پول بغاوت ابھی ابھی کچلی گئی تھی۔ گلیم لکھتا ہے کہ "ڈرے ہوئے پولوں کے نظارہ نے نوجوان افسر کے دل پر بہت اثر کیا اور اس میں مطلق العنانی کا خوف بو دیا۔" آخر دو سال کے بعد اس نے فوجی زندگی کو خیرباد کہا۔ 1834ء میں استعفیٰ دے کر ماسکو چلا گیا۔ جہاں وہ چھ سال تک فلسفہ کا مطالعہ کرتا رہا۔ اس وقت کے تمام فلسفی طالب علموں کی طرح وہ بھی ہیگل پرست بن گیا۔ اور 1840ء میں آخرکار پروفیسر بننے کے ارادے سے برلن میں تعلیم جاری رکھنے کے لیے چلا گیا۔ لیکن اس کے بعد اس کے خیالات میں ایک تیز انقلاب آیا۔ اس کے لیے ہیگل کے اس مقولہ کو ماننا مشکل ہو گیا کہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے عقلی ہے اور 1842ء میں وہ ڈارون چلا گیا۔ جہاں آرنلڈ دیوجے سے اس کی آشنائی ہو گئی۔ اب وہ ایک انقلابی ہو چکا تھا اور آئندہ سال حکومت اس کے خلاف ہو گئی۔ وہ سوئزرلینڈ چلا گیا۔ جہاں جرمن کیمونسٹوں کے ایک گروہ سے اس کی راہ و رسم ہو گئی۔ چونکہ پولیس اسے تنگ کرتی اور روسی حکومت اس کی واپسی کا مطالبہ کرتی تھی۔ اس لیے وہ پیرس چلا گیا۔ جہاں 1843ء سے 1847ء تک رہا۔ پیرس کے یہ سال اس کے خیالات کو پختہ کرنے اور بنانے میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ پرودھن سے اس کی واقفیت ہو گئی جس سے وہ بہت متاثر ہوا جارج سنیڈ اور دیگر کئی چیدہ لوگوں سے بھی اس کی دوستی ہو گئی۔ یہیں پیرس میں وہ پہلے پہل مارکس اور اینگلز سے متعارف ہوا۔ جن کے ساتھ اسے عمر بھر لڑنا تھا۔ بہت بعد کہیں 1871ء میں اس نے اپنے اور مارکس کے

تعلقات پر یہ بیان دیا: "مارکس مجھ سے بہت آگے بڑھا ہوا تھا جیسا کہ وہ آج بھی ہے۔ اگرچہ زیادہ آگے نہیں۔ لیکن مجھ سے کہیں زیادہ پڑھا لکھا ہے۔ میں اس وقت سیاسی اکانومی بالکل نہیں جاننا چاہتا تھا اور ابھی مابعد کے دھندوں سے چھٹکارا نہیں پا سکتا تھا۔ میری سوشلزم محض طبیعی تھی وہ اگرچہ مجھ سے کم عمر تھا۔ مگر اس وقت ناستک' سمجھا بوجھا مادہ پرست اور مانا ہوا سوشلسٹ تھا۔ انہیں دنوں اس نے اپنے موجودہ نظام کی بنیادیں رکھیں۔ ہم اکثر ملتے رہتے۔ کیونکہ اس کے علم پرولتاری مقصد کے لیے اس کی پرورش اور سنجیدہ محبت (اگرچہ اس میں ہمیشہ خود نمائی ملی ہوتی) کے سبب میں اس کا احترام کیا کرتا اور اس کے ساتھ گفتگو کے لیے بیتاب رہتا۔ جو ہمیشہ مفید اور ہوشیار ہوا کرتی۔ جب اس میں بے جا نفرت کی چاشنی نہ ہوتی۔ جو افسوس اکثر ہوا کرتی تھی۔ لیکن ہم میں کبھی کھلی بے تکلفی نہ تھی۔ ہماری طبیعتیں یہ برداشت نہ کر سکتیں تھیں۔ وہ مجھے جذباتی خیال پرست کہا کرتا اور وہ حق بجانب تھا میں اسے نمائشی' بے وفا' چالاک کہا کرتا اور میں بھی حق بجانب تھا۔"

بکونن جہاں کہیں بھی کچھ عرصہ رہا حکومت اس کے خلاف ہو گئی۔ نومبر 1847ء میں پولوں کی بغاوت کی حمایت میں تقریر کی بنا پر روسی سفارت کے کہنے سننے پر اسے فرانس سے نکال دیا گیا جس نے عوام کی ہمدردی چھین لینے کی خاطر یہ افواہ پھیلا دی کہ وہ روسی حکومت کا ایجنٹ تھا۔ لیکن چونکہ اب دور نکل چکا ہے اس لیے اب اس کی ضرورت نہیں۔ فرانسیسی حکومت کی پر معنی خاموشی نے اس کہانی کو اور چمکایا اور زندگی بھر اس کے دامن سے یہ داغ دھل نہ سکا۔

فرانس سے نکالے جانے پر وہ برسیلز پہنچا۔ جہاں مارکس سے دوبارہ آشنائی ہوئی۔ اس وقت کا لکھا ہوا ایک خط ظاہر کرتا ہے کہ اس میں وہ شدید نفرت پہلے ہی گھر کر چکی تھی۔ جس کے لیے بعد میں اس کے پاس وجوہات تھے۔ "جرمن کاریگر بورن سٹڈ اینگلز اور ان سب سے بڑھ کر مارکس یہاں اپنی شرارتوں میں مصروف تھے۔ خود

نمائی، کینہ بکواس، زبانی لاف، عملی بزدلی، عمل اور زندگی پر وچار اور عمل اور زندگی سرے سے غائب۔ باتونی دلیلیں لڑنے والے پیشہ ور اور ان کے فضول نخرے۔۔۔۔ بورژوا بورژوا اور آئے دن کے کہے جانے سے لفظ بورژوا نفرت کا باعث بن گیا۔ لیکن خود وہ سارے کے سارے سر سے پاؤں تک صوبائی بورژوا ہیں۔ ایک لفظ میں جھوٹ اور لغویت لغویت اور جھوٹ۔ ایسی فضا میں آزاد سانس لینے کی امید نہیں۔ میں ان سے بالکل الگ رہتا ہوں اور فیصلہ کر رکھا ہے کہ ان پیشہ وروں کے اشتراکی اتحاد میں شامل نہیں ہوں گا۔ اور ان سے کوئی سروکار نہ رکھوں گا۔

1848ء کے انقلاب نے اسے پیرس لوٹنے پر آمادہ کیا۔ اور اس کے بعد جرمنی کی طرف۔ ایک معاملہ پر اس کی مارکس سے جھڑپ ہو گئی۔ جس کے متعلق اس نے بعد میں اعتراف کیا کہ مارکس سچائی پر تھا۔ پریگ میں وہ سلافی کانگرس کا ممبر بن گیا۔ جہاں اس نے سلافی بغاوت پھیلانے کی ناکام کوشش کی۔ 1848ء کے آخر میں اس نے سلافوں سے اپیل شائع کی کہ دوسرے انقلابیوں کے ساتھ مل کر روس، آسٹریا، پروشیا تین جابر حکومتوں کو تباہ کر دو۔ مارکس نے اس پر اعتراض کیا۔ کہ بوہمین آزادی کی تحریک عبث ہے کیونکہ سلافوں کا کوئی مستقبل نہیں۔ کم از کم ان طبقوں میں جہاں وہ جرمنی اور آسٹریا کے ماتحت ہیں۔ بکونن نے مارکس پر جرمنی پرستی کا الزام لگایا اور مارکس نے اسپرپان سلاوزم کا اور دونوں درست تھے۔ اس جھگڑے سے پہلے ایک اور زیادہ گہری لڑائی دونوں میں ہو چکی تھی۔ مارکس کے اخبار نے بیان کیا کہ جارج سینڈ کے پاس ایسے کاغذات موجود ہیں جو بکونن کو روسی حکومت کا ایجنٹ ثابت کرتے ہیں اور پولوں کی تازہ گرفتاری کا ذمہ دار بتاتے ہیں۔ بکونن نے اس بہتان سے بریت ظاہر کی اور جارج سینڈ نے بھی اخبار مذکور کو لکھا کہ یہ بیان بے بنیاد ہے مارکس نے تردیدیں بھی شائع کر دیں اور برائے نام سمجھوتہ ہو گیا۔ لیکن اس وقت سے لے کر دونوں حریف لیڈروں میں مخالفت کبھی بھی حقیقی طور پر کم نہ ہوئی جو دوبارہ 1864ء سے

پہلے نہ مل سکے۔

اس مدت میں ہر جگہ ردعمل ہو رہا تھا۔ مئی 1849ء میں ڈرسڈن میں ایک بغاوت نے وقتی طور پر انقلابیوں کو شہر کا مالک بنا دیا۔ پانچ دن تک ان کا قبضہ رہا۔ اور ایک انقلابی حکومت قائم کی گئی۔ اس میں بکونن اس مدافعت کی جان تھا۔ جو پروشین لشکروں کے خلاف کی گئی۔ لیکن وہ مغلوب ہو گئے اور آخر میسزاور رچرڈ ویگنر کے ساتھ جن میں سے دوسرا خوش قسمتی سے اپنی موسیقی کے باعث گرفتار نہ کیا گیا۔ بکونن بچنے کی کوشش میں گرفتار ہوا۔

اب بہت سی جیلوں اور ملکوں میں اسیری کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ بکونن کو 16 جنوری 1850ء کو سزائے موت ہوئی۔ لیکن پانچ ماہ بعد اس کی سزا گھٹا دی گئی اور اسے آسٹریا کے حوالے کر دیا گیا۔ جس نے اسے سزا دینے کا حق ظاہر کیا۔ آسٹریوں نے بھی مئی 1851ء میں اسے سزائے موت دی اور پھر اسے عمر قید میں بدل دیا۔ آسٹروی جیلوں میں اس کے ہاتھ پاؤں میں بیڑیاں ہوتیں اور ایک میں تو اسے دیوار کے ساتھ جکڑ دیا گیا تھا۔ شاید بکونن کو سزا دینے میں کوئی خاص لطف تھا کیونکہ روسی حکومت نے بھی اپنی باری میں اسے طلب کیا۔ روس میں پہلے وہ پیٹر اور پال فورٹرس اور پھر سوشلبرگ میں قید رہا۔ یہاں اسے سکروی کی شکایت ہو گئی اور اس کے تمام دانت کر گئے کسی قسم کی خوراک کا کھانا اس کے لیے ناممکن ہو گیا۔ لیکن ہرچند اس کا جسم وبلا ہو گیا۔ اس کی روح غیر متاثر رہی۔ اسے سب سے بڑھ کر اس بات کا خوف تھا کہ کہیں کسی دن جیل کے کمزور کر دینے والے عمل سے وہ پستی کی انتہا پر نہ پہنچ جائے۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ نفرت کرنا چھوڑ نہ دے۔ کہیں بغاوت کی آگ اس کے دل میں سرد نہ ہو جائے۔ وہ اپنے سزا دینے والوں کو معاف کر دینے پر نہ اتر آئے۔ اور تن بہ تقدیر نہ ہو جائے۔ لیکن یہ خوف سطحی تھا۔ اس کی قوت نے اسے ایک دن بھی جواب نہ دیا اور وہ جیل کے کمرے سے وہی پہلا بکونن نکلا۔

زار نکولس کی موت کے بعد اکثر قیدیوں کی جاں بخشی کی گئی۔ لیکن بکونن کا نام الگزینڈر دوم نے خود فہرست سے مٹا دیا۔ جب بکونن کی ماں نئے زار سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ تو اس نے اسے کہا۔ "دیکھو میڈم جب تک تمہارا بیٹا زندہ ہے وہ کبھی آزاد نہیں ہو سکتا" تاہم 1857ء میں آٹھ سال کی اسیری کے بعد اسے سائیبریا کی ذرا آزاد فضا میں بھیج دیا گیا۔ وہاں سے وہ 1861ء میں جاپان نکل جانے میں کامیاب ہوا اور پھر امریکہ سے ہوتا ہوا لندن پہنچ گیا۔ اسے حکومتوں کی مخالفت کے باعث قید کیا گیا تھا۔ لیکن حیرت ہے کہ اس کی تکلیفیں اس کے دل میں، سزا دینے والوں کے لیے محبت نہ پیدا کر سکیں۔ اس وقت سے اس نے انارکسٹ بغاوت کی روح کو عام کر دینے میں اپنے آپ کو لگا دیا۔ اگرچہ اس کے بعد مزید قید کا موقع نہ آیا کچھ سال وہ اٹلی میں رہا۔ جہاں اس نے 1864ء میں بین الاقوامی اخوت' یا سوشلسٹ انقلابیوں کا اتحاد قائم کیا۔ اس میں بہت سے ملکوں کے لوگ تھے۔ لیکن کوئی جرمن نہ تھا۔ اس کا زیادہ تر کام میزینی کی نیشنلزم سے مقابلہ رہا۔ 1867ء میں وہ سوئزرلینڈ چلا گیا جہاں آئندہ سال میں اس نے سوشل ڈیموکریسی کا بین الاقوامی اتحاد قائم کرنے میں مدد دی اور اس کا پروگرام تیار کیا۔ یہ پروگرام اس کے خیالات کا بہت عمدہ خلاصہ پیش کرتا ہے۔ یہ اتحاد اپنے ناستک ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ اور جماعتوں کا پورا خاتمہ چاہتا ہے۔ دونوں جنسوں کے لیے پوری سیاسی اور سماجی مساوات چاہتا ہے۔ یہ اتحاد چاہتا ہے کہ زمین اور محنت کے سامان باقی سرمایہ کی طرح جماعت کی مشترکہ ملکیت ہوں۔ کام کرنے والوں کے سوا کوئی انہیں استعمال نہ کرے یعنی کاشتکاری اور صنعتی سنگوں کے سوا یہ اتحاد تسلیم کرتا ہے کہ تمام موجودہ سیاسی ادارے اور حکومتیں اپنے اپنے ملکوں کے انتظام تک محدود رہ کر آزاد سبھاؤں کے عالمگیر اتحاد میں زرعی اور صنعتی لحاظ سے گھل مل جائیں' یہ اتحاد بین الاقوامی مزدور ایسوسی ایشن کی ایک شاخ بننا چاہتا تھا۔ لیکن اس بنا پر اجازت نہ مل سکی کہ شاخیں مقامی نہ ہونی چاہئیں۔ اور خود بخود انٹرنیشنل نہیں ہو سکتیں۔ اتحاد کا

جنیوا گروپ جولائی 1869ء میں شامل کر لیا گیا۔

بین الاقوامی مزدور سنگ کی بنیاد لندن میں 1864ء میں پڑی۔ اور اس کے آئین اور پروگرام مارکس نے تیار کیے تھے۔ بکونن کو ابتدا میں اس کی کامیابی پر شک تھا اور اس نے اس میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ لیکن یہ اکثر ملکوں میں حیرت انگیز تیزی کے ساتھ پھیلا اور سوشلسٹ خیال کے پروپیگنڈا کے لیے بڑی طاقت بن گیا ابتدا میں یہ بالکل سوشلسٹ خیال کے پروپیگنڈا کے لیے بڑی طاقت بن گیا ابتدا میں یہ بالکل سوشلسٹ نہ تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ مارکس نے اسے اپنا ہم خیال کر لیا اور ستمبر1868ء کو برسیلز کے مقام پر تیسری کانگرس کے موقع پر وہ بالکل سوشلسٹ تھا پہلی بے تعلقی پر پچھتاکر بکونن نے اس میں ملنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اور اپنے ساتھ فرانسیسی سوئزرلینڈ' فرانس اور اٹلی کے بہت سے پیروکار لایا۔ چوتھی کانگرس میں جو ستمبر1869ء کو بیل میں ہوئی۔ دو مدیں بہت نمایاں تھیں۔ جرمن اور انگریزی ذاتی ملکیت کے اٹھ جانے پر مارکسی حکومت کے حامی تھے۔ وہ مختلف ملکوں میں مزدور جماعتیں بنانے اور پارلیمنٹوں میں مزدور نمائندے بھیجنے میں اس کے ساتھ تھے۔ اس کے برعکس لاطینی قومیں بکونن کے نقش قدم پر حکومت اور نمائندہ حکومت کے خلاف تھیں۔ دونوں فریقوں میں لڑائی بھڑکتی گئی اور ہ رایک دوسرے کو الزام دیتا بکونن کے جاسوس ہونے کی داستان دہرائی گئی۔ لیکن تحقیق کے بعد واپس لی گئی۔ مارکس نے ایک خفیہ خط میں اپنے جرمن دوستوں کو لکھا کہ بکونن پان سلاوزم پارٹی کا ایجنٹ ہے اور ان سے پچیس ہزار فرانک سالانہ لیتا ہے۔ ادھر بکونن وقتی طور پر روس میں کاشتکاری بغاوت بھڑکانے میں لگ گیا۔ اور بڑے آڑے وقت اس نے انٹرنیشنل میں مقابلہ کو بھلا دیا۔ فرانس اور پروشیا لڑائی کے درمیان میں بکونن نے فرانس کی پرجوش حمایت کی خصوصاً" نپولین سوم کے زوال کے بعد۔ اس نے لوگوں کو 1793ء ایسی انقلابی مخالفت کے لیے ابھارنے کی کوشش کی۔ اورلیوس کے مقام پر ایک ناکام بغاوت میں پھنس گیا۔ فرانسیسی حکومت

نے اسے پروشیا کا تنخواہ دار ایجنٹ سمجھا اور وہ بمشکل بچ کر سوئزرلینڈر نکل گیا۔ مارکس اور اس کے پیروؤں سے اس کا جھگڑا قومی جھگڑوں کے باعث بھڑک اٹھا تھا۔ بکونن کروپا تکن کی طرح جرمنی کی نئی طاقت کو دنیا کی آزادی کے لیے خطرہ سمجھتا تھا۔ وہ جرمنوں کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا کچھ .سمارک کے باعث لیکن سب سے زیادہ مارکس کے باعث آج تک انارکزم لاطینی ممالک تک محدود رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ جرمنی کی نفرت وابستہ ہے جو انٹرنیشنل میں مارکس اور بکونن کے جھگڑے سے پیدا ہوئی۔

بکونن پارٹی کو 1870ء میں ہیگ کے مقام پر انٹرنیشنل کی عام کانگرس میں ہمیشہ کے لیے دبا دیا گیا۔ یہ کانگرس عام اکٹھ کی جگہ جنرل کونسل کی چنی ہوئی تھی اور اس میں مارکس بلامقابلہ تھا۔ بکونن کے دوست کہتے ہیں کہ اس کی تہہ میں یہ تھا کہ فرانس اور جرمن حکومتوں کی مخالفت کے باعث بکونن اور اس کے دوستوں کا ہیگ میں آنا مشکل ہوگیا۔ بکونن کو ایک رپورٹ کی بنا پر انٹرنیشنل سے نکال دیا گیا جس میں دوسری باتوں کے علاوہ اس پر چوری کا بھی الزام لگایا گیا تھا۔

اس طرح گو انٹرنیشنل آمیزش سے بچالی گئی لیکن افسوس کہ جسم کو روح کی قیمت پر بچایا گیا۔ اس وقت سے وہ بذات خود قوت نہ رہی۔ اور دونوں گروہ مختلف پارٹیوں میں کام کرنے لگے۔ سوشلسٹ بہت جلد ترقی کر گئے۔ 1889ء میں ایک نئی انٹرنیشنل بنائی گئی جو موجودہ جنگ کے پھوٹ پڑنے تک زندہ رہی۔ انٹرنیشنل سوشلزم کے مستقبل کی پیش گوئی کرنا جلد بازی ہو گی۔ اگرچہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ بین الاقوامی خیال اتنی طاقت پکڑ چکا ہے۔ کہ جنگ کے بعد شاید اظہار کے ان ذریعوں کی ضرورت پڑے۔ جو گذشتہ سوشلسٹ کانگرسوں میں پائے جاتے ہیں۔

اب بکونن کی صحت جواب دے چکی تھی اور چند وقتوں کے سوا وہ باقی عمر علیحدگی میں رہا اور 1876ء میں مر گیا۔

بکونن کی زندگی مارکس کے برعکس بہت طوفانی رہی ہے۔ حکومت کے خلاف ہر قسم کی مخالفت سے اسے ہمدردی ہو جاتی۔ اس کی حمایت میں وہ اپنی پروا نہ کرتا۔ اس کا بڑھا ہوا اثر زیادہ تر بڑی بڑی شخصیتوں پر اس کے ذاتی اثر کا پیدا کردہ تھا اس کی تحریریں مارکس سے اس قدر مختلف ہیں جس قدر ان کی زندگی ان میں بے ربطی ہے۔ اکثر وقتی حادثہ کی ابھاری ہوئی ہیں جب وہ سیاست حاضرہ پر بحث کرتا ہے تو اقتصادی واقعات کے ساتھ آنکھ سے آنکھ نہیں ملاتا۔ صرف تھیوری اور مابعد دنیا کا ذکر کرتے ہوئے وہ کنکھیوں سے دیکھ لیتا ہے جب وہ ان زینوں سے اترتا ہے۔ تو مارکس سے کہیں زیادہ مروجہ بین الاقوامی سیاست کے بس میں ہو جاتا ہے۔ اس خیال کے نتائج کی اس میں بہت کم چاشنی ہے۔ کہ اقتصادی اسباب ہی بنیادی ہیں اور وہ مارکس کے اس نظریہ کے عام کرنے والے کی حیثیت سے تعریف کرتا تھا۔ لیکن خود اس کے باوجود قوموں کے نام پر سوچتا رہا۔ اس کی سب سے بڑی تصنیف میں زیادہ تر فرانکو پروشین جنگ کے بعد کے دنوں میں فرانس کی حالت اور جرمن امپریلزم کی تدبیروں پر بحث کی گئی ہے اس کی اکثر تحریر دو بغاوتوں کے درمیانی وقفہ میں جلدی سے لکھی گئی تھی اور اس میں ادبی ہمواری کا نہ ہونا بھی انارکزم کا پتہ دیتی ہے اس کی بہترین کتاب ایک جز ہے جسے اس کے ایڈیٹروں نے "خدا اور حکومت" کا عنوان دیا۔ حکومت رعب سے' قوت سے' طاقت کا جنون اور نمائش ہے یہ نرمی نہیں جانتی دلوں کو موہ لینا نہیں چاہتی.... اچھائی لے کر اٹھتی ہے۔ مگر اسے تلف کر دیتی ہے۔ روک دیتی ہے۔ کیونکہ رعب سے کام لیتی ہے اور ہر رعب بجا طور پر آزادی کے لیے بغاوتوں کو بھڑکاتا اور تیز کرتا ہے اور اچھائی پر جس وقت رعب کا رنگ آ جاتا ہے۔ وہ صحیح اخلاق کے نکتہ سے برائی بن جاتی ہے۔ یہاں میرا مطلب انسانی اخلاق سے ہے۔ انسانی احترام اور آزادی کے نقطہ نظر سے آزادی۔ اخلاق اور تمدن کی انسانی شان اسی میں ہے کہ وہ نیکی کرے لیکن اس لیے نہیں کہ اس کا حکم ملا ہے۔ بلکہ اس لیے کہ وہ خود اسے سمجھتا

ہے چاہتا ہے اور محبت کرتا ہے۔"

ہم بکونن کی تصنیفوں میں اس سماج کی صاف تصویر نہیں دیکھتے۔ جس کے وہ خواب دیکھتا تھا۔ نہ کوئی دلیل ملتی ہے کہ ایسی سوسائٹی پائیدار بھی ہو سکے گی اور انارکزم کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس کے پیروؤں خصوصاً" کروپا ٹکن کی طرف لوٹنا پڑے گا۔ جو اس کی طرح ایک روسی امیر گھرانے کا فرد تھا۔ یور کی جیلوں سے مانوس ہو چکا تھا اور اس کی طرح ایک انارکسٹ بھی تھا۔ جس میں انٹرنیشنلزم کے باوجود جرمنوں سے نفرت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

کروپا ٹکن کی اکثر تحریروں میں پیداوار کے فنی پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ "کھیت فیکٹریوں اور کارخانے" اور "روٹی کا سوال" میں اس نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہ اگر پیداوار زیادہ سائنٹیفک اور باقاعدہ ہو جائے۔ تو کام کی بہت معمولی سی مقدار تمام آبادی کی آسائش کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔ یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ وہ ذرا مبالغہ سے کام لیتا ہے۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس کی باتوں میں بہت سچائی ہے پیداوار کے مضمون پر اعتراض کرتے ہوئے اس نے ظاہر کیا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ صحیح معنوں میں نازک مسئلہ کیا ہے۔ اگر تہذیب اور ترقی کو مساوات کے ساتھ ساتھ رہنا ہے۔ تو اس کے لیے ضروری ہے کہ مساوات کا مطلب ضروریات زندگی کے لیے گھنٹوں کی جان کھپائی نہ ہو۔ کیونکہ جہاں کوئی فراغت نہیں۔ وہاں آرٹ اور سائنس مر جائیں گے اور ترقی ناممکن ہو جائے گی۔ محنت کی امکانی پیداوار کے پیش نظر سوشلزم اور انارکزم پر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ جس نظام تک کروپا ٹکن جانا چاہتا ہے۔ ممکن ہو یا نہ ہو۔ اس کے لیے آج سے کہیں زیادہ سدھرے ہوئے پیداوار کے طریقہ کی ضرورت ہے۔ وہ اجرت کو بالکل ختم کر دینا چاہتا ہے اور سوشلسٹوں کی طرح ان معنوں میں نہیں کہ ایک آدمی کو مطلوبہ کام کی نسبت اس کے کام کی طرف آمادگی کے باعث اجرت ملے گی۔ بلکہ زیادہ بنیادی معنوں میں اس میں کام کے لیے کوئی مجبوری نہ ہو گی

اور تمام چیزوں میں کل آبادی برابر کی شریک ہو گی کروپا ٹکن کام کو خوشگوار بنانے کے امکان پر بہت اعتماد رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس برادری میں جس کا وہ تصور کرتا ہے۔ عملاً ہر ایک بے کاری پر کام کو ترجیح دے گا۔ کیونکہ کام میں زیادتی یا غلامی نہیں۔۔۔۔ بلکہ دن کے چند گھنٹے ایک خوشگوار سی سرگرمی ہو گی۔ کام انسان کے فطری تعمیری جذبات کے لیے نکاس کا کام دے گا۔ اس میں کوئی جبر کوئی قانون کوئی حکومت طاقت استعمال کرنے کے لیے نہیں ہو گی۔ برادری کے قانون ہوں گے۔ لیکن وہ عام رضامندی سے بنائے گئے ہوں گے کسی جبر یا دباؤ سے نہیں۔ ہم کسی دوسرے باب میں دیکھیں گے۔ کہ یہ خیال کہاں تک پورا ہو سکتا ہے لیکن اس سے انکار نہیں کہ کروپا ٹکن اسے غیر معمولی دلربائی اور خوبصورتی سے پیش کرتا ہے۔

لیکن یہ انصاف نہیں ہو گا اگر ہم انارکزم کا تاریک پہلو دکھانے سے گریز کریں جس پہلو نے اسے پولیس سے ٹکرایا اور عام شہریوں کے لیے اسے 'ہوا' بنا دیا ہے اس کے عام اصولوں میں ایسی کوئی بات نہیں جسے تشدد کا کوئی طریقہ یا سرمایہ دار سے زبردست نفرت کا پرچار کہا جا سکے۔ اور اکثر لوگ جو ان اصولوں پر چلتے ہیں۔ ذاتی طور پر بہت مہربان اور مزاج کے لحاظ سے تشدد کے خلاف ہیں۔ لیکن انارکسٹ پریس اور عام لوگوں کا لب و لہجہ اس حد تک تلخ ہے کہ اسے فہمیدہ نہیں کہا جا سکتا اور خصوصاً" لاطینی ملکوں میں تو اس کی اپیل خوش نصیبوں سے حسد کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔ نہ کہ بدنصیبوں پر ترس کھانے کے لیے ایک صاف اور پڑھنے کے لائق بیان اگرچہ مخالف نقطۂ نظر سے ٹیکس ڈباٹس کی ایک کتاب "انارکسٹ خطرہ" میں دیا ہوا ہے۔ جو انارکسٹ اخباروں میں سے متعدد کارٹون پیش کرتا ہے قانون سے بغاوت قدرتی طور پر ان بعض آدمیوں کو چھوڑ کر جن میں انسانیت بہت غالب ہے عام مروجہ اخلاقی قوانین میں ڈھیل اور جوابی ظلم کی تلخ ذہنیت کی طرف لے جاتی ہے جس سے نیکی پیدا نہیں ہو سکتی۔

عام انارکزم کی سب سے عجیب بات اس کی شہید پرستی ہے جس میں عیسائی رسموں کی بھونڈی نقل کی جاتی ہے اور صلیب کی جگہ گلوٹن کو دی جاتی ہے حکومتوں کے ہاتھوں اپنے تشدد کی پاداش میں موت کا منہ دیکھنے والے اکثر ایسے ہیں جو اپنے مقصد کی راہ میں مصیبتیں دیکھنے والے ہوئے ہیں۔ لیکن دوسرے جن کی ویسی ہی عزت کی جاتی ہے زیادہ قابل اعتراض ہیں۔ دبے ہوئے مذہبی جذبے کے اس نکاس کی سب سے عجیب مثال رویکل کی پرستش تھی جسے بم کی مختلف وارداتوں کے باعث 1892ء میں گلوٹن کی نذر کیا گیا۔ اس کا ماضی مشکوک تھا۔ لیکن وہ مردانہ وار مرا اس کے آخری فقرے ایک مشہور انارکسٹ کے گیت تھے جیسا کہ قدرتی تھا۔ ذمہ دار انارکسٹوں نے اس کی یاد منانے میں کوئی حصہ نہ لیا پھر بھی اسے عجیب شان سے پورا کیا گیا۔

ایسے واقعات کی روشنی میں انارکسٹ نظریئے یا اس کے بڑے بڑے دعویداروں کے خیالات کو دیکھنا بالکل نامناسب ہو گا۔ لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ انارکزم کی طرف ایسے لوگ زیادہ جھکے ہوتے ہیں۔ جن کی حرکتیں عموماً مجنونانہ اور مجرمانہ رنگ لیے ہوتی ہیں۔ ذمہ دار لوگوں کو ناسمجھ پبلک سے تمیز کرنے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے۔ اور ایک عام نفرت کے زیر اثر تحریک کے رسوا کرنے والوں کو ان سچے جوانمرد اعلیٰ دماغ انسانوں سے غلط ملط نہیں کرنا چاہیے جنھوں نے اس کے نظریئے ترتیب دیئے۔ اور اس کی اشاعت کے لیے اپنی آسائش اور کامیابی کو نثار کر دیا۔ دہشت پھیلانے والوں کی لڑائی جس میں رویکل جیسے انسان سرگرم تھے۔ عملاً 1894ء کو ختم ہو چکی ہے۔ اس وقت سے لے کر پلوٹیر کے زیر اثر اچھے انارکسٹوں نے ٹریڈ یونینوں وغیرہ میں انقلابی سنڈیکلزم کے پرچار میں ایک کم خطرناک نکاس ڈھونڈ لیا ہے۔

سوسائٹی کی اقتصادی ترتیب جس کا نام انارکسٹ تصور کرتے ہیں سوشلزم سے زیادہ جدا نہیں ہے۔ اختلاف صرف حکومت کے معاملہ میں ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ حکومت میں اکثریت کو نہیں سب کو دخل ہوا۔ اس سے انکار نہیں کہ اکثریت کی

حکومت بھی اقلیت کی حکومت کی طرح آزادی کی اسی قدر دشمن ہو سکتی ہے۔ اکثریت کے خدائی حق کے اصول میں بھی صداقت کی اتنی ہی کمی ہے۔ جتنی کمی دوسروں میں ایک زبردست جمہوری سلطنت آسانی سے اپنے ان بہترین شہریوں پر ظلم کو آمادہ ہو سکتی ہے جن کی دماغی خودمختاری انہیں ترقی کے لیے قوت بنا سکتی ہے جمہوری پارلیمنٹوں کے تجربہ نے ظاہر کر دیا ہے کہ ابتدائی سوشلسٹوں کی اس سے توقعات بہت دور از کار تھیں۔ اور اس کے خلاف انارکسٹوں کی بغاوت کوئی اچنبھے کی بات نہیں لیکن خالص انارکزم کی شکل میں یہ بغاوت کمزور اور کہیں کہیں رہی ہے صرف سنڈیکلزم اور اس کی پیدا کی ہوئی تحریکوں نے پارلیمانی حکومت اور مزدور کی رہائی کے لیے خالص سیاسی ذرائع کے خلاف بغاوت کو عام کیا ہے۔ لیکن اس پر نئے باب میں بحث کرنی چاہیے۔

تیسرا باب

سنڈیکلسٹ بغاوت

فرانس میں سنڈیکلزم سیاسی سوشلزم کے خلاف بغاوت کی حیثیت سے اٹھی۔ اور اسے سمجھنے کے لیے ہمیں مختصر طور پر سوشلسٹ پارٹیوں کے مختلف ملکوں میں اثرورسوخ کا نقشہ کھینچنا چاہیے۔

فرانس اور پروشیا کے درمیان لڑائی سے بری طرح پچھاڑ کھا کر سوشلزم سہارے لیتی اٹھی۔ اور مغربی یورپ کے تمام ملکوں میں پچھلے چالیس سال سے اس کا رسوخ زیادہ ہوتا گیا۔۔۔۔ لیکن جیسا کہ بڑھتے ہوئے فرقے میں ہوتا آیا ہے۔ ایمان کی شدت ایمان لانے والوں کے بڑھنے کے ساتھ گھٹ گئی ہے۔

جرمنی میں سوشلسٹ پارٹی ریشتاغ کا ٹکڑا بن کر رہ گئی اور اس کے ممبروں میں اختلاف خیال کے باوجود اس نے اپنے ضابطہ اتحاد کو اسی فوجی ڈسپلن کے جذبہ کے ساتھ قائم رکھا۔ جو جرمن قوم کی خصوصیت ہے۔ 1912ء کے ریشتاغ الیکشن میں کل ووٹوں میں سے اس نے تیسرا حصہ حاصل کیا اور 397 میں سے 110 ممبر بھیجے۔ بیبس کی وفات کے بعد (Revisionist) جنہیں برنسٹن نے حرکت دی تھی۔ مارکسیوں پر غالب آ گئے اور پارٹی تیز خیال ریڈیکلزم بن کر رہ گئی۔ یہ قیاس کرنا ابھی قبل از وقت ہے۔ کہ سوشلسٹ اقلیت اور اکثریت میں جو پھوٹ جنگ کے دوران میں پڑی اس کا اثر کیا ہو گا۔ جرمنی میں بسنڈیکلزم کا نشان تک نہیں اور وہاں اس کے اس نظریہ کو کوئی حمایت نہیں ملی کہ صنعتی عمل کو سیاسی اقدام پر ترجیح دینی چاہیے۔

انگلینڈ میں مارکس کے پیرو کبھی زیادہ نہیں ہوئے۔ یہاں سوشلزم زیادہ تر فابیوں کی اکسائی ہوئی ہے۔ جنہوں نے 1883ء میں بنیاد رکھی اور انقلاب مارکس کے نظریہ قدر اور جماعتی لڑائی کا چولا اتار پھینکا۔ ان میں صرف سٹیٹ سوشلزم اور "ادخال" کا نظریہ رہ گیا ہے۔ یعنی سرکاری ملازمتوں میں اس خیال کے ساتھ گھسا جائے کہ سوشلزم ان کی قوت کو زیادہ کرے گی۔ ٹریڈ یونین میں اس اعتقاد سے گھسا جائے کہ خالص صنعتی عمل کا زمانہ ہو چکا اور اب انہیں سوشلسٹ پروگرام کے ایسے حصوں کو چلانے کے لیے جو امیروں میں مخالفت نہ پیدا کریں۔ حکومت کے آستانہ سے لو لگانی چاہیے۔ آزاد لیبر پارٹی (جو 1893ء میں قائم ہوئی) پہلے پہل فابیوں کے انہیں خیالوں کی اکسائی ہوئی تھی۔ اگرچہ آج تک اور خصوصاً جنگ کے بھڑک اٹھنے کے وقت سے سوشلسٹ بواس میں سے آتی ہے۔ وہ ہمیشہ مزدوروں کی صنعتی جماعت بندیوں کے ساتھ مل کر کام کرنے پر زور دیتی ہے۔ اور زیادہ تر اسی کی کوشش نے 1900ء میں ٹریڈ یونین اور سیاسی سوشلسٹوں کے ملاپ سے مزدور پارٹی قائم کی۔ 1909ء سے اس پارٹی کے ساتھ تمام اہم جماعتوں کا تعلق ہے۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود کہ اس کی قوت ٹریڈ یونین سے حاصل کی ہوئی ہے یہ ہمیشہ صنعتی عمل کی نسبت سیاسی عمل کے لیے اٹھی ہے۔ اس کی سوشلزم بھی نظری اور ادبی قسم کی ہے۔ اور عملاً جنگ کے پھوٹ پڑنے تک پارلیمنٹ کے مزدور ممبر جن میں سے تیس 1906ء میں بیالیس 1910ء میں چنے گئے تھے۔ بہت حد تک لبرل پارٹی کا ایک حصہ کہے جا سکتے تھے۔

انگلینڈ اور جرمنی کے برعکس فرانس روز بروز گھٹتے ہوئے یقین کے ساتھ پرانے نعرے دہرانا نہیں چاہتا تھا۔ وہاں ایک نئی تحریک نے (جس کا ابتدائی نام انقلابی سنڈیکلزم تھا اور بعد میں نراسنڈیکلزم رہ گیا) اصلی جذبہ کو مرنے نہ دیا اور لفظوں کے پیچھے نہ جاتے ہوئے اس نے پرانے سوشلسٹوں کی روح سے غداری نہ کی۔ سوشلزم اور انارکسزم خیالوں سے شروع ہوئیں اور کہیں بعد میں انہوں نے وہ

جماعتیں پیدا کیں۔ جن پر ان خیالات کو چسپاں کیا گیا۔ سنڈیکلزم کو سمجھنے کے لیے پہلے فرانس میں ٹریڈ یونین اور اس کے سیاسی ماحول کو بیان کرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد سنڈیکلزم کے خیالات اس وقت کی سیاسی اور اقتصادی حالت کا قدرتی نتیجہ نظر آئیں گے۔ ان میں سے کوئی بھی نیا خیال نہیں ہے۔ تقریباً" سارے کے سارے قدیم انٹرنیشنل کے بکونن گروپ سے لیے ہوئے ہیں۔ فرانس اور پروشیا کی لڑائی سے پہلے فرانس میں قدیم انٹرنیشنل کو کافی کامیابی ہوئی۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ 1869ء میں اس کے فرانسیسی ممبروں کی تعداد 1/4 لاکھ تھی۔ اور اسی سال بیل کے مقام پر انٹرنیشنل کانگرس میں ایک فرانسیسی نمائندے نے ایک پروگرام پیش کیا جو بعد میں سنڈیکلسٹ پروگرام بنا۔

1870ء کی جنگ نے وقتی طور پر فرانس میں سوشلسٹ تحریک کو ختم کر دیا اور حوبزگزڈ نے اسے پھر 1877ء میں نئی زندگی بخشی۔ جرمن سوشلسٹوں کے برعکس فرانسیسی بہت سے ٹکڑوں میں بٹے ہوئے تھے۔ 1900ء کے بعد کے ابتدائی سالوں میں پارلیمانی سوشلسٹوں اور کمیونسٹ انارکسٹوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ بعد الذکر کہتے تھے کہ سوشل انقلاب کا پہلا کام حکومت کا خاتمہ ہونا چاہیے اس لیے اسے پارلیمانی سیاست سے کیا غرض۔ انارکسٹ 1883ء کے بعد پیرس اور جنوب میں کامیاب رہے۔ سوشلسٹ کہتے کہ سوشلسٹ سوسائٹی قائم ہو جانے پر حکومت خود بخود نہ رہے گی۔ 1882ء میں سوشلسٹ گزڈ (جو مارکس کی انقلابی اور عملی سوشلزم کی نمائندگی کرتا تھا) اور پال بروس کے پیروں میں بٹ گئے۔ جو زیادہ زمانہ ساز اور ابن الوقت کہے جاتے تھے۔ کیونکہ انہیں مارکس کے اصولوں کی بڑی پروا نہ تھی 1890ء میں بروسیوں میں سے کچھ کٹ کر "المے ن" کے پیچھے لگ گئے اور پارٹی کے زیادہ انقلابی مادوں کو اپنا کر بعض زبردست سنڈیکیٹوں کی جان بن گئے۔ ایک اور گروہ آزاد سوشلسٹ تھا۔ جس میں ملرنیڈ جیزس وغیرہ شامل تھے۔

سوشلسٹوں کے مختلف فرقون میں جھگڑوں نے تجارتی جماعتوں کے لیے دشواریاں کھڑی کر دیں اور سیاست کو ان سے الگ تھلگ رکھنے کا ریزولیشن پاس کرنے میں مدد دی۔ یہاں سے سنڈیکلزم بس ایک قدم تھی۔

1905ء سے وہ سوشلسٹ پارٹیوں میں سمجھوتہ کے باعث سوشلسٹوں کے صرف دو گروہ رہ گئے ہیں---- متحدہ سوشلسٹ پارٹی اور آزاد جو اعلیٰ دماغ ہیں اور کسی پارٹی کے ساتھ جکڑے جانا پسند نہیں کرتے۔ 1914ء کے عام انتخاب میں 590 میں سے اول 102 اور دوسرے 30 ممبر ہوئے۔

مختلف گروپوں میں میل ملاپ کی باتیں ایک ایسے واقعہ کے سبب بنتے بنتے رہ گئیں جس کی اہمیت فرانس میں بڑھتے ہوئے سیاسی خیالات کی ساری نشوونما کے لیے بہت زیادہ تھیں۔ وہ واقعہ ویلڈک روسو وزارت میں ملرنیڈ کا عہدہ کو قبول کر لینا تھا۔ ملرنیڈ جیسا کہ خیال تھا سوشلسٹ نہ رہا اور سیاسی عمل کے مخالف اپنی سیاسی جیت میں اس مثال کو پیش کرتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ بہت سے فرانسیسی سیاستدانوں نے جو کسی مقام پر پہنچے ہیں۔ اپنی سیاسی زندگی سوشلسٹ کی حیثیت سے شروع کی اور ہڑتالیوں کو دبانے کے لیے فوجیں کام میں لاتے ہوئے اسے چھوڑ دیا۔ ملرنیڈ کا فعل ان مثالوں میں زیادہ قابل ذکر اور ڈرامائی تھا۔ اس کا اجتماعی اثر یہ ہوا کہ فرانس کے زیادہ سوجھ بوجھ والے مزدوروں میں سیاست کے متعلق ایک بے دلی سی پیدا ہو گئی ہے اور یہ حالت سنڈیکلزم پھیلانے میں بہت مددگار ہوئی۔

سنڈیکلزم خریدار کی حمایت میں نہیں۔ بلکہ اجناس پیدا کرنے والے کی حمایت میں کھڑی ہوتی ہے۔ اس کا کام اصل کام کو سدھارنا اور صنعت کو ترتیب دینا ہے اور کام کے لیے محض بڑے بڑے انعام لینا نہیں۔ اس خیال میں اس کی قوت اور امتیازی شان ہے۔ یہ سیاسی عمل کو صنعتی سے بدلنا اور تجارتی جماعتوں کو انہیں مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہے۔ جن کے لیے پکی سوشلزم پارلیمنٹ کی طرف جاتی ہے۔

سنڈیکلزم (ابتدا میں تجارتی اتحاد) ایک فرانسیسی نام تھا لیکن فرانس کے تجارتی سنگ دو فرقوں میں بٹ گئے---- ایک سدھارک اور دوسرا انقلابی۔ ان میں سے دوسرے کے خیالات وہ ہیں جنہیں آج ہم سنڈیکلزم کے ساتھ لکھتے ہیں یہ قیاس کرنا بالکل ممکن نہیں ہے کہ کہاں تک سنڈیکلسٹوں کے خیال یا جماعت بندی جنگ کے ختم ہونے تک سوچی رہے گی۔ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں۔ اس کا تعلق جنگ کے پہلے کے سالوں سے ہو گا۔ ممکن ہے فرانسیسی سنڈیکلزم ایک امتیازی تحریک کی حیثیت سے مر جائے۔ لیکن اس صورت میں اس کی اہمیت زائل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس نے جرمنی کے سوا تمام مہذب ممالک میں مزدور تحریک کے طاقت ور حصہ کو نئی روح اور امنگ بخشی ہے۔

جس جماعت کا سنڈیکلزم کو سہارا تھا۔ وہ سی جی ٹی ہے۔ جو اگرچہ 1895ء میں قائم ہوئی۔ لیکن کہیں 1902ء میں اپنے اصلی روپ میں آئی۔ تعداد کے لحاظ سے یہ کبھی بھی طاقتور نہیں رہی ہے۔ لیکن اس کا اثر اس میں ہے کہ آڑے وقت وہ لوگ بھی اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں جو ممبر نہیں ہوتے تھے۔ جنگ سے ایک سال پہلے اس کی ممبری مسٹر کول کے مطابق نصف لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ 1884ء میں ویلڈک روسو وزارت نے تجارتی جماعتوں کو جائز قرار دیا اور سی جی ٹی کی ترکیب 700 سنڈیکیٹوں کی فیڈریشن سے 1895ء میں ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ "بورس ڈی ٹریویل فیڈریشن" بھی تھی۔ جس کی بنیاد 1893ء میں رکھی گئی۔ بورس کسی ایک پیشہ کی نہیں۔ بلکہ عام مقامی مزدوروں کی ایک مقامی جماعت ہوتی ہے۔ تبادلہ محنت کا کام دیتی اور مزدور کے لیے وہی کچھ کرتی ہے۔ جو چیمبر آف کامرس کارخانہ دار کے لیے۔ عام معنوں میں سنڈیکیٹ ایک صنعت کی مقامی جماعت ہے اور اسی لحاظ سے بورس ڈی ٹریویل سے چھوٹی ہوتی ہے۔ پلوٹیر کی قابل لیڈری میں یہ فیڈریشن سی جی ٹی سے بھی کہیں زیادہ پھلی پھولی اور آخر 1902ء میں اس کے ساتھ مل گئی۔ اس کا نتیجہ ایک

ایسی جماعت میں نکلا جس میں مقامی سنڈیکیٹ دوبارہ شریک ہو۔ ایک بار دوسری مقامی سنڈیکیٹوں کے ساتھ بورس ڈی ٹریوریل بناتے ہوئے اور پھر دوسرے مقاموں میں ایک ہی صنعت کی سنڈیکیٹوں کے ساتھ نئی تنظیم کا مقصد یہ تھا کہ ہر سنڈیکیٹ کی ممبری کو دوبارہ مضبوط کر لیا جائے۔ اسے مقامی بورس اور اس کی صنعت کی فیڈریشن سے ملا دیا جائے۔ سی جی ٹی کے آئین صاف صاف کہتے ہیں کہ کوئی سنڈیکیٹ سی جی ٹی کا حصہ نہیں بن سکتی۔ اگر وہ قومی طور پر فیڈرائی نہیں گئی اور لوربس یا مقامی یا سنڈیکیٹوں کی محکمانہ یونین سے وابستہ نہیں ہے لیگارڈل تشریح کرتا ہے کہ اس طرح دونوں فرقے ایک دوسرے کی اصلاح کریں گے صنعتوں کی قومی فیڈریشن مقامی خودغرضیوں کو روک دے گی اور مقامی تنظیم ٹریڈ یونین کی روح کو بے لگام نہ ہونے دے گی۔ مزدور فوراً" ایک مقام کے مزدوروں اور ایک پیشہ کے مزدوروں کی مضبوطی کو جان جائیں گے اور اسے جان لینے پر تمام مزدور جماعت کے استحکام کو بھی جان لیں گے۔

اس تنظیم کا سہرا پلوئید کے سر ہے۔ جو اس فیڈریشن کا 1894ء سے لے کر 1901ء تک (جس سال اس کی وفات ہوئی) سیکرٹری رہا۔ وہ ایک انارکسٹ کمیونسٹ تھا اور اس نے فیڈریشن اور پھر سی جی ٹی پر بھی جب اس کا فیڈریشن سے اتحاد ہو گیا اپنا رنگ چڑھا دیا۔ اور اپنے اصولوں کو فیڈریشن کے چلانے میں بھی استعمال کیا۔ کمیٹی کا کوئی صدر نہ تھا۔ اور ووٹ بہت ہی کم ڈالے گئے۔ اس کا بیان ہے کہ انقلاب کا کام انسان کو صرف ہر رعب ہی سے نہیں۔ بلکہ ہر اس ادارے سے جس کا اولیں مقصد پیداوار کا سلجھاؤ نہیں ہے۔ نجات دینا ہے۔

سی جی ٹی ہر ایک حصہ کو کافی خود مختاری دیتی ہے۔ ہر سنڈیکیٹ چھوٹی ہو یا بڑی ایک ہے۔ یہاں وہ سرگرمیاں دیکھنے میں نہیں آتیں۔ جو انگریزی سنگتوں کے کام کا لمبا چوڑا حصہ ہوتی ہیں۔ یہ حکم نہیں دیتی صرف مشورہ دیتی ہے اور یونین میں سیاست کو

نہیں گھسنے دیتی۔ یہ فیصلہ اس حقیقت کے سامنے کیا گیا کہ سوشلسٹوں میں پھوٹ نے سنگوں کو بھی بگاڑ دیا تھا۔ لیکن اب ایک اہم طبقے کے دماغوں میں عام انار کسٹی سیاست پسندی کے ذریعے اسے پھر داخل کیا گیا ہے۔ سی جی ٹی ایک لڑنے والی جماعت ہے۔ ہڑتالوں میں یہ سارے مزدوروں کی جان ہے۔ سی جی ٹی میں ایک سدھارک گروہ بھی ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ اقلیت میں رہا ہے۔ اور تمام باتوں کے لیے انقلابی سنڈیکلزم کا جو محض لیڈروں کا کریڈ ہے دست و بازو ہے۔

سنڈیکلزم کا اہم نظریہ جماعت جنگ ہے۔ جسے سیاسی ذریعوں سے نہیں۔ بلکہ صنعتی ذرائع سے چلایا جاتا ہے۔ بڑے بڑے صنعتی ذریعے ہڑتال۔ بائیکاٹ اور مشینیں خراب کرنا ہیں۔ بائیکاٹ کی مختلف شکلیں اور یہ ظاہر کرنے والے لیبل کو کام ٹریڈ یونین کے ماتحت کیا گیا ہے۔ امریکہ کی مزدور لڑائیوں میں بہت کام دے چکے ہیں۔ جب ہڑتال کسی سبب سے ناممکن یا ناپسندیدہ نظر آئے۔ بگاڑ' ردی کام کرنا یا کل پرزوں اور کیے ہوئے کام کو خراب کرنا کارخانہ دار سے نپٹنے کا ایک طریقہ اس کی کئی شکلیں ہیں۔ جن میں سے بعض بے طرز ہیں' اور بعض بہت قابل اعتراض بگاڑ کی ایک شکل جسے دوکانداروں کے ملازم کام میں لاتے ہیں۔ یہ ہے کہ گاہکوں کو چیزوں کے متعلق صاف صاف باتیں بتا دی جائیں۔ یہ طریقہ دوکاندار کے کاروبار کے لیے کتنا ہی نقصان وہ کیوں نہ ہو۔ اخلاقی بنیادوں پر قابل اعتراض نہیں ہے ایک طریقہ جسے ریلوے میں خصوصاً اطالوی ہڑتالوں میں اختیار کیا گیا یہ ہے کہ تمام قانونوں کو ہو اس طرح مانا جائے کہ گاڑیوں کا چلنا محال ہو جائے۔ ایک کام یہ ہے کہ سارے کام بڑی احتیاط سے کیے جائے۔ اس طرح اگرچہ کام بہت ستھرا ہوگا۔ لیکن بہت تھوری مقدار میں ہو گا۔ ایسی بے ضرر شکلوں سے بڑھتے بڑھتے ہم ایسے فعلوں پر اتر آئے ہیں جنہیں ہر لحاظ سے برا کہا جا سکتا ہے مثلاً ریلوں کے حادثے وغیرہ۔ بگاڑ کے حمایتی اس کو جنگ کا ایک حصہ بتا کر صفائی پیش کرتے ہیں۔ لیکن اپنی زیادہ تشدد بھری شکلوں میں تو یہ ظالم اور شاید

ناروا بھی ہے۔ جبکہ اپنی نرم حالتوں میں بھی کام میں پھوہڑپن پیدا کر دیتا ہے جو بہت ممکن ہو اس دور میں بھی قائم رہے جو سنڈیکلسٹ لانا چاہتے ہیں اگر رپورٹ درست ہے تو ایک بڑے پیمانے پر اس کی مثال روسی انقلاب میں دیکھی جا سکتی ہے۔ لیکن جب سرمایہ دار اس طریقہ کو اخلاقی ہیبت ظاہر کرتے ہیں۔ تو اس کے ساتھ یہ بھی جاننا چاہیے کہ جب کبھی حالات ان کا ساتھ دیتے ہیں۔ وہ خود بھی ایسی ہی حرکتیں کرتے ہیں۔

سنڈیکلسٹ طریقوں میں سے سب سے اہم ہڑتال ہے۔ خاص مقصدوں کے لیے معمولی ہڑتالیں محض تیاری سمجھی جاتی ہیں۔ یا تنظیم کو مکمل کرنے اور جوش بڑھانے کا ذریعہ لیکن ہڑتالیں کامیاب ہوں یا نہ ہوں سنڈیکلسٹ ان کو صنعتی امن کے لیے کوئی فضا پیدا کرنے والی نہیں سمجھتے۔ وہ ہڑتالوں کو ان اصلاحوں کے حاصل کرنے کے لیے استعمال کرنے کی نیت نہیں رکھتے۔ جو کارخانہ دار پوری کر دیں۔ بلکہ وہ مالک اور ملازم کے اس سارے نظام کو ہی تباہ کر دینا اور مزدور کو پورے طور سے آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے عام ہڑتال کی ضرورت ہے۔ جس میں مزدوروں کی کافی تعداد کام بالکل بند کر دینے سے سرمایہ داری کی جڑیں ہلا دے۔ سورل جو پڑھے لکھے طبقے میں سنڈیکلزم کا زیادہ پرچار کرتا ہے۔ تجویز کرتا ہے کہ عام ہڑتال کو عیسائی مذہب کی "دوسری زندگی" کی طرح افسانہ بنا دینا چاہیے لیکن یہ خیال چست سنڈیکلسٹوں کو راس نہیں آتا۔ اگر انہیں یہ منوایا جائے کہ عام ہڑتال محض افسانہ ہی ہے۔ تو ان کی قوت مرجھا جائے گی اور سارا نظریہ دھندلا ہو جائے گا۔ یہ اس کے ممکن ہونے میں صاف اور سیدھا یقین ہی جو انہیں اکسا رہا ہے۔ سیاسی سوشلسٹ ان کو اس پر بہت لے دے کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل کر لینے سے میدان مارا جا سکتا ہے لیکن سنڈیکلسٹوں کو سیاستدانوں کی دیانت پر اعتماد نہیں کہ وہ کسی ایسے طریقے پر بھروسہ کر بیٹھیں یا کسی

ایسے انقلاب کی قدر پر ایمان لائیں۔ جو حکومت کی طاقت کو بحال رکھتا ہو۔

سنڈیکلسٹوں کے مقاصد ان کے طریقوں سے کم واضح ہیں۔ جو ذہین لوگ ان کی ترجمانی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ انہیں حرکت اور تبدیلی چاہنے والوں کی ایک جماعت ظاہر کرتے ہیں جو برگسانی کے پیچھے لگے ہیں اور جنہیں اس منزل کی طرف صاف جھلک کی کوئی ضرورت نہیں۔ جس کی طرف وہ لے جا رہی ہے۔ مگر کچھ بھی ہو۔ ان کے مقاصد کا منفی حصہ کافی صاف ہے۔ وہ حکومت کو مٹانا چاہتے ہیں۔ جسے وہ مزدوروں کو ڈرانے کے لیے بنایا ہوا سرمایہ داری اڈہ سمجھتے ہیں وہ یہ ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ کہ سوشلسٹ نظام میں وہ بہتر ہوجائے گی۔ وہ ہر صنعت کو خودمختار دیکھنا چاہتے ہیں لیکن مختلف صنعتوں کے درمیان تعلقات سنوارنے پر ان کے خیالات صاف نہیں ہیں۔ وہ فوج کے خلاف ہیں۔ کیونکہ حکومت کے خلاف ہیں اور کیونکہ ہڑتالوں میں ان کے خلاف فرانسیسی فوجیں اکثر استعمال کی گئی ہیں۔ اس لیے بھی کہ وہ انٹرنیشنل ہیں جن کا ایمان ہے کہ ہر جگہ مزدور کا واحد کام یہی ہے کہ سرمایہ دار کے ظلم سے رہائی پائے زندگی کے متعلق ان کا نظریہ عافیت کیشوں کے بالکل الٹ ہے۔ لیکن وہ حکومت کے درمیان لڑائیوں کے اس لیے خلاف ہیں کہ وہ ان مقاصد کے لیے نہیں لڑی جاتیں۔ جن کا مزدوروں کی زندگی سے کچھ بھی تعلق ہے۔ ان کی فوج کی مخالفت سب سے بڑھ کر انہیں جنگ سے پہلے کے سالوں میں حاکموں سے ٹکرانے کا باعث بنی۔ لیکن جیسا کہ خیال تھا فرانس پر حملہ ہو جانے پر زندہ نہ رہ سکی۔

سنڈیکلزم کے اصول ایک مضمون کے ذریعے واضح کیے جا سکتے ہیں۔ جو ستمبر 1911ء کے "سنڈیکیٹ ریلوے مین" کے پہلے نمبر میں شائع ہوا۔ ذیل کی عبارت اسی سے منقول ہے: "سنڈیکلزم، اجتماعیت، انارکزم موجودہ اقتصادی نظام اور اکثر اشیا کی موجودہ ذاتی ملکیت کے ختم کرنے پر زور دیتی ہے۔ لیکن جہاں اجتماعیت ہر ایک کی ملکیت پر زور دیتی ہے۔ اور انارکزم کسی کی ملکیت کو گوارا نہیں کرتی۔ سنڈیکلزم

منظم محنت کی ملکیت کے ارادے رکھتی ہے اس طرح یہ سوشلزم کے پرچار کیے ہوئے اقتصادی اصول اور جماعتی لڑائی کا خاص ٹریڈ یونین کے نقطہ نظر سے مطالعہ ہے۔ یہ اس پارلیمانی عمل کو سختی سے کوستی ہے۔ جس کا اجتماعیت سہارا لیتی ہے اور اس لحاظ سے انارکزم کے زیادہ قریب ہے جس سے عملاً" وہ عمل کے دائرہ کے محدود ہونے پر اختلاف رکھتی ہے۔"

سچ تو یہ ہے کہ سنڈیکلزم اور انارکزم کے درمیان اتنا باریک پردہ ہے کہ اسے عیاری کے ساتھ منظم انارکی کہہ دینا مشکل نہیں۔ فرانس کی تجارتی جماعتوں نے اسے جنم دیا۔ لیکن اصل میں یہ ایک بین الاقوامی پودا ہے۔ جس کی جڑوں کو برطانیہ کی مٹی بہت موافق آئی ہے۔ اجتماعیت یا مارکسی سوشلزم یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ سنڈیکلزم صاف طور پر ایک مزدور تحریک ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے اور یہ انارکزم بھی نہیں ہے۔ کیونکہ ان میں سے ایک محض بورژوا اور دوسری امادتی ہے۔ نیز ان دونوں میں کتابی علم کی بہت بھرمار ہے۔ اس کے برخلاف یہ سنڈیکلزم اپنی اصل اور مقاصد کے لحاظ سے مزدور پرست ہے جسے جماعتوں سے کوئی سروکار نہیں۔ اور وہ انہیں اکھاڑ پھینکنے پر تلی ہوئی ہے۔ اکتوبر 1910ء کا "ٹائمز" جو تنہا سارے انگریزی پریس میں سے سنڈیکلزم کے ساتھ رہا ہے عام ہڑتال کی اہمیت ان لفظوں میں بیان کرتا ہے : "اسے سمجھنے کے لیے ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ فرانس میں ایک زبردست مزدور جماعت ہے جس کا صاف صاف ارادہ ایسا انقلاب لانے کا ہے جس میں سوسائٹی کا موجودہ نظام ہی نہیں بلکہ حکومت بھی بہہ جائے گی۔ اس کا سنڈیکلزم ہے۔ یہ سوشلزم نہیں بلکہ اس سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ کیونکہ اس کا خیال ہے کہ حکومت ہی سب سے بڑا دشمن ہے اور سوشلسٹوں کا حکومت یا اجتماعی ملکیت کا نظریہ آج سے کہیں زیادہ مزدور کی قسمت کو تاریک کر دے گا۔ اسی مقصد کو وہ عام ہڑتال کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جسے بیس سال پہلے ایک مزدور فرانسیسی نے

ایجاد کیا اور 1894ء میں فرانسیسی مزدور کانگرس نے سوشلسٹوں سے ایک زبردست لڑائی کے بعد اپنایا۔ اس وقت سے عام ہڑتال سنڈیکلسٹوں کی اعلانیہ پالیسی ہے۔ جن کی جماعت کا نام سی جی ٹی ہے۔

دوسرے لفظوں میں سمجھدار فرانسیسی مزدور کو احساس ہو چکا ہے کہ سوسائٹی اور حکومت انسانی عمل کی دو جدا جدا فضاؤں کو ظاہر کرتی ہیں۔ جن کے درمیان کوئی لازمی یا دل پسند رشتہ نہیں ہے۔ ایک کے بغیر انسان قبیلہ پسند ہوتے ہوئے زندہ نہیں رہ سکتا۔ جب کہ دوسرے کے بغیر وہ شاداب زندگی بسر کرے گا۔ ایک مدبر عہدہ کے گھمنڈ میں بدباطن نہ بھی ہو۔ پھر بھی قوم پر ایک غیرضروری بوجھ ضرور ہے۔

سنڈیکلسٹوں کی حکومت سے بہت جھڑپیں ہوئیں۔ 1907ء اور 1908ء میں اس خونریزی کے خلاف پروٹسٹ کرتے ہوئے جو ہڑتالوں کو دبانے میں ہوئی۔ سی جی ٹی کمیٹی نے ایک اعلان شائع کیا جس میں حکومت کو بوچڑوں کی حکومت کہا گیا اور وزیراعظم کو قاتل کلیمنشو کا خطاب دیا گیا۔ 1908 میں دلینوسینٹ جارجز کی ہڑتال مین بھی ایسے واقعات پر کمیٹی کے چیدہ چیدہ ممبر گرفتار کر لیے گئے۔ 1910ء اکتوبر کی ریلوے ہڑتال میں ایم بریان نے ہڑتال کمیٹی کو قید کر لیا۔ ریلوے ملازموں کو تیار کیا اور ہڑتالیون کی جگہ پر لگانے کے لیے سپاہیوں کو بھیج دیا۔ ان کڑے طریقوں سے ہڑتال بالکل رہ گئی۔ اور اس کے بعد سی جی ٹی کی توجہ عسکریت اور قومیت کے خلاف رہی۔

سنڈیکلزم کی طرف انارکزم کی نگاہ ہمدردانہ ہے۔ البتہ وہ عام ہڑتال کے طریقوں کو پرتشدد انقلاب کا جسے اکثر انارکسٹ ضروری گنتے ہیں۔ بدل نہیں سمجھتے اس معاملہ میں ان کا رویہ اگست 1907ء کے ایمسٹرڈم کی انٹرنیشنل انارکسٹ کانگرس میں واضح کیا گیا تھا۔ اس کانگرس نے تمام ملکوں کے کامریڈوں سے مزدور جماعت کی خودمختار تحریکوں میں حصہ لینے اور سنڈیکلسٹ جماعتوں میں شخصی آزادی اور مضبوطی کے خیال پھیلانے کی سفارش کی جو انارکزم کی جان ہیں ساتھیوں کو "براہ راست کاروائی کی

ان شکلوں اور اعلانوں کی حمایت یا اشاعت کرنے کو کہا گیا جن میں انقلابی خون گرم ہو اور جو سوسائٹی کی کایا پلٹ کی راہ کو جائیں" یہ پاس کیا گیا کہ انارکسٹوں کا خیال ہے کہ سرمایہ دار اور پر رعب سوسائٹی کی تباہی صرف باہتھیار بغاوتوں اور جبری بے تعلقیوں ہی سے ہو سکتی ہے اور عام ہڑتال اور سنڈیکلسٹ تحریک کا استعمال حکومت کی فوجی طاقت کے خلاف لڑائی میں کہیں ہمارے زیادہ سیدھے ذریعوں کو بھلا دینے والا ثابت نہ ہو۔

سنڈیکلسٹ جواب دے سکتے ہیں کہ جس تحریک میں مسلح بغاوت کے ذریعے جیتنے کی قوت ہے۔ اس میں عام ہڑتال کے ذریعے جیتنے کی بھی کافی سکت ہے۔ مزدور تحریکوں میں تشدد کے ذریعے جیتنے کا امکان ان حالتوں میں بہت کم ہے۔ جن میں بغیر تشدد کے وہ ممکن ہے ایک اور ایک ہی دلیل انارکسٹ کانگرس کے سارے دعووں کا جواب ہے۔

سنڈیکلزم دستکاری یونین کے مقابل صنعتی یونین کی دعویدار ہے۔ اس لحاظ سے اور سیاسی طریقوں پر صنعتی طریقوں کو ترجیح دینے میں اس تحریک کا ایک حصہ ہے جو فرانس سے دور پار پہنچ چکی ہے صنعتی اور دستکاری اتحاد پر مسٹر کول نے بہت کچھ لکھا ہے : "دستکاری اتحاد ان مزدوروں کو ایک لڑی میں پروتا ہے۔ جو ایک ہی صنعتی لائن پر ہوتے ہیں۔ یا ان مختلف خطوں پر جو آپس میں اس قدر ہم شکل ہوتے ہیں کہ ایک دوسرے کا کام کر سکتا ہے"۔ لیکن ممکن ہے جماعت کیے ہوئے کام پر نہیں بلکہ صنعت کے اصلی ڈھانچے کی راہ پر جائے اور ایک جنس پیدا کرنے کے لیے کام کرنے والے مزدور ایک یونین میں لائے جائیں..... اس صورت میں تنظیم کی بنیاد ایک آدمی کا پیشہ یا کارخانہ دار نہیں بلکہ وہ خدمت ہو گی ۔ جس پر اسے لگایا گیا تھا اور یہ حقیقی معنوں میں صنعتی اتحاد ہے۔

صنعتی اتحاد امریکہ کی پیداوار ہے اور امریکہ سے کسی حد تک برطانیہ میں پھیلا

ہے۔ لڑنے والی جماعت کی یہ قدرتی شکل ہے۔ جب یونین کو کسی ایک اصلاح کے لیے نہیں بلکہ اقتصادی نظام میں بنیادی انقلاب کا ذریعہ سمجھا جائے۔ یہی نقطہ نگاہ "دنیا کے صنعتی مزدوروں" کا ہے جنہیں عموماً I.W.W کہا جاتا ہے یہ جماعت کم و بیش امریکہ میں وہی کچھ ہے جو فرانس میں جنگ سے پہلے سی جی ٹی تھی۔ دونوں میں تھوڑے بہت فرق کا باعث دونوں ملکوں کے اقتصادی حالات کا اختلاف ہے لیکن ان میں روح ایک ہے I.W.W سوسائٹی کی آخری شکل پر جو وہ اسے دینا چاہتی ہے۔ ایک خیال کی نہیں ہے۔ اس میں سوشلسٹ، انارکسٹ اور سنڈیکلسٹ سبھی ہیں لیکن فوری عملی جھگڑوں میں اس کا رویہ صاف ہے۔ کہ جماعتی جنگ سرمایہ اور محنت کے موجودہ تعلقات میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور نجات صنعتی عمل خصوصاً ہڑتال ہی سے حاصل ہو سکتی ہے I.W.W سی جی ٹی کی طرح تعداد میں اتنی زیادہ نہیں ہے جتنا کہ اس سے ڈرنے والے سمجھتے ہیں۔ اس کا اثر اس کی تعداد میں نہیں۔ بلکہ آڑے وقت مزدور ہمدردی جیت لینے میں ہے۔

امریکہ میں مزدور تحریک تشدد کی خصوصیت رکھتی ہے۔ سی جی ٹی کے سیکرٹری مسٹر جو ہیکس نے بھی اعتراف کیا ہے کہ I.W.W کے مقابلہ میں سی جی ٹی بالکل نرم ہے وہ کہتا ہے کہ I.W.W فوجی عمل کا پرچار کرتے ہیں۔ جو امریکہ کے لیے بہت ضروری ہے لیکن فرانس میں پنپ نہیں سکتا۔ اس کا دلچسپی حال ایک ایسے مصنف کی زبان سے جو نہ سرمایہ داروں کا حامی ہے نہ مزدوروں کا بلکہ تشدد اور انقلاب کے بغیر بے لاگ ہو کر سماجی مسئلہ کا حل چاہتا ہے "امریکن سنڈیکلزم" (مصنفہ جان گراہم بروکس) میں درد ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ امریکہ میں مزدوروں کا مسئلہ یورپ سے بہت مختلف ہے۔ چونکہ وہاں مالیاتی طاقت بہت زیادہ ہے اس لحاظ سے سرمایہ کا ایک مرکز پر سمٹے جانا امریکہ میں مارکسی حدود کے بہت قریب آ گیا ہے۔ دوسرے غیر ملکی مزدوروں کا سیلاب اسے یورپ سے بالکل انوکھا کر دیتا ہے۔ پرانے ماہر مزدور زیادہ تر

امریکہ میں پیدا ہوئے اور مسٹر گمپرس کے ماتحت کبھی کے امریکن مزدور فیڈریشن میں پروئے جا چکے ہیں۔ یہ مزدور امارت کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اور باہر سے آئے ہوئے اناڑی مزدوروں کے انبوہ کے خلاف کارخانہ داروں سے ملے ہوئے ہیں۔ اور انہیں کسی طرح بھی مزدور تحریک کا کوئی حصہ نہیں کہا جا سکتا۔ کول لکھتا ہے کہ اب امریکہ میں دو مزدور جماعتیں ہیں۔ دونوں کا معیار زندگی جدا جدا ہے اور دونوں اس وقت کارخانہ دار کے سامنے ہتھیار ڈالے ہوئے۔ ان دونوں جماعتوں کا ملاپ اور اشتراک ناممکن ہے۔ امریکن مزدور فیڈریشن اور I.W.W دو جدا جدا اصول پیش کرتی ہیں اور مزدور تحریک کے دو مختلف گروہ ہیں۔ I.W.W صنعتی اتحاد اور امریکن مزدور فیڈریشن دستکاری اتحاد کی نمائندہ ہے۔ پہلی کی بنیاد 1905ء میں مختلف جماعتوں کے اتحاد سے پڑی جن میں سے کان کھودنے والوں کی مغربی فیڈریشن زیادہ ممتاز تھی اور جو 1892ء میں قائم ہوئی ڈیلین کے پیروکاروں کے الگ ہو جانے سے جو سوشلسٹ مزدور پارٹی کا لیڈر اور "ووٹ نہ دو" کی پالیسی رکھتا تھا۔ اور تشدد کو ناپسند کرتا تھا۔ انہیں کافی نقصان ہوا۔ اس کی قائم کی ہوئی پارٹی کے دفتر ڈی ٹرائٹ میں ہیں اور بڑا دفتر شکاگو میں I.W.W میں اگرچہ فرانسیسی سنڈیکلزم سے کم واضح فلسفہ ہے۔ لیکن سرمایہ داری نظام تباہ کرنے میں اس کے ارادے اسی قدر پختہ ہیں۔ جیسا کہ اس کے سیکرٹری نے کہا ہے I.W.W ملازم رکھنے والی جماعت کے ساتھ ایک ہی سودا کر سکتی ہے---- اور وہ صنعت پر سارے اختیار کو پورے طور سے منظم مزدوروں کے ہاتھ میں دے دینا ہے۔ کانیں کھودنے والوں کی مغربی فیڈریشن کا لیڈر مسٹر ہے وڈ جہاں تک جماعتی لڑائی اور زائد قدر کے مسئلہ کا تعلق ہے۔ پکا مارکسی ہے۔ لیکن ان سب کی طرح جو اس تحریک میں شریک ہیں وہ یورپ کے مارکسی چیلوں سے زیادہ صنعتی عمل کو سیاسی عمل پر ترجیح دیتا ہے کسی حد تک وہ حالات اس کی تفسیر کر دیتے ہیں۔ جو امریکہ میں نوواردوں کو بے ووٹ کر دینے والے ہیں۔ I.W.W کی چوتھی مجلس نے اپنی کاروائی کے عام اصولوں کی

ایک تمہید پر نظر ثانی کی کہ "مزدور جماعت اور سرمایہ دار جماعت میں کوئی چیز مشترک نہیں جب تک لاکھوں مزدوروں میں بھوک اور محتاجی پائی جاتی ہے اور چند سرمایہ دار زندگی کی نعمتوں پر ہاتھ صاف کرتے ہیں کوئی امن نہیں ہو سکتا۔ ان دونوں جماعتوں میں لڑائی ٹھنی رہنی چاہیے۔ یہاں تک کہ دنیا کے مزدور ایک ہو جائیں۔ زمین اور آلات پیداوار پر قبضہ کر لیں اور اجرت کے طریقہ کو ختم کر دیں۔ پرانے خیال والوں کے مقولہ کی جگہ "مناسب کام کے مناسب دام" ہمیں اپنے جھنڈے پر یہ انقلابی نعرہ لکھنا چاہیے۔ "اجرت کا طریقہ ختم کر دو"

I.W.W اور مغربی فیڈریشن نے متعدد ہڑتالیں کیں یا کروائی ہیں یہ ہڑتالیں باقی دنیا میں سے زیادہ شدید اور تلخ جماعتی لڑائی کا نمونہ پیش کرتی ہیں دونوں فریق ہتھیاروں پر اترنے کو تلے رہتے ہیں۔ سرمایہ داروں کی اپنی فوجیں ہیں اور زیادہ کٹھن وقت میں وہ ملکی فوج کو بھی بلا سکتے ہیں۔ حکومت کے متعلق فرانسیسی سنڈیکلسٹوں کا خیال امریکہ میں بالکل ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح پیدا ہونے والے شاخسانوں کے لیے فیڈرل گورنمنٹ نے 1915ء میں صنعتی تعلقات پر ایک کمیشن بٹھایا۔ جس کی رپورٹ ان حالات کو بے نقاب کرتی ہے۔ جن کا برطانیہ میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں لکھا ہے کہ "صنعتی جھگڑوں میں تشدد اور بد نظمی کا باعث بنیادی حقوق کو توڑنا اور سرکاری اداروں کی الٹ پلٹ اور تخریب ہے ان حالات میں قانون کو فوجی نظام کے ماتحت کر دینے کی سفارش کی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جھگڑے کے دوران میں حکومت کے ہر فرد کی آزادی اور زندگی گورنر کے رحم پر ہو گی۔ مزید یہ ہڑتالوں کے انتظام میں حکومت کے لشکروں کو استعمال کیا جائے 1914ء میں لڈلو کے مقام پر فوج اور کان کھودنے والوں میں ٹھن گئی۔ جس میں فوج کے گولی چلا دینے سے کئی عورتیں اور بچے مر گئے۔ سخت گھمسانوں کی اور بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ لیکن ممالک متحدہ میں مزدور جھگڑے کی حالت کے متعلق بہت کچھ کہہ دیا گیا ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ

یہ کیفیت اس وقت تک رہے گی۔ جب تک مزدوروں کی کافی تعداد نوواردوں کی ہے۔ جب یہ تکلیفیں دور ہو جائیں گی جیسا کہ زود یا بدیر ہوتا ہے۔ محنت کش جماعت میں اپنی جگہ نکال لے گی اور مخالفت اور دشمنی کم ہو جائے گی جو جماعتی لڑائی کی انتہائی شکل کو ممکن کر دیتی ہے۔ جب وہ وقت آئے گا۔ امریکہ میں مزدور تحریک یورپ کا سا لباس پہن لے گی۔ بہرکیف شکلیں جدا سہی رگوں میں وہی خون ہے اور صنعتی اتحاد امریکہ سے پھیلتا ہوا برطانیہ پر بھی کافی چھا چکا ہے۔ جسے فرانسیسی سنڈیکلزم نے مزید قوت دی۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر ٹریڈ یونین سوسائٹی کے اقتصادی ڈھانچے کو من مانی تبدیلی دینا چاہتی ہے۔ تو دستکاری اتحاد کی نسبت صنعتی اتحاد زیادہ ضروری ہے۔ صنعتی اتحاد لوگوں کو اپنے دشمن کے مطابق جس سے وہ لڑنا چاہتے ہیں۔ منظم کرتا ہے۔ اور دستکاری اتحاد میں یہ بات نہیں۔ انگریزی اتحاد پرستی صنعتی انداز سے بہت دور ہے اگرچہ بعض صنعتیں (خصوصاً ریلوے والوں کی اس راہ میں بہت دور نکل چکی ہیں اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ ریلوے والے صنعتی سنگھٹن اور سنڈیکلزم کو ہمدرد نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

خالص سنڈیکلزم کے لیے برطانیہ میں کوئی اچھی فضا نہیں ہے۔ اس کی روح ہمارے مزاج سے زیادہ انقلابی اور نراجک ہے۔ البتہ گلڈ سوشلزم کی نرم سی شکل میں سی جی ٹی اور I.W.W کے خیالات پھل لاتے نظر آ رہے ہیں۔ یہ تحریک ابھی اپنے گہوارہ میں ہے اور لوگوں پر اس کا اثر ابھی کچھ زیادہ نہیں ہوا۔ لیکن نوجوانوں کا ایک گروہ دانائی کے ساتھ اس کا پرچار کر رہا ہے اور ان میں وہ بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے جو آئندہ سالوں میں مزدور خیال کو بنانے والے ہوں گے جنگ نے حکومت کی طاقت کو اتنا بڑھا دیا ہے کہ جو لوگ قدرتی طور پر اشیا کو ان کے اصلی رنگ میں دیکھنا پسند نہیں کرتے ان کے لیے یہ خیال کرنا دوبھر ہو رہا ہے کہ حکومت کی ہمہ گیری بھی دنیا کو جنت بنا سکتی ہے۔ گلڈ سوشلسٹ صنعتی آزادی چاہتے ہیں اور حکومت کی طاقت کا

خاتمہ نہیں۔ بلکہ اس میں کمی چاہتے ہیں۔ میرے خیال میں ان کا طریقہ سب سے بہتر اور ایسا ہے۔ جو تشدد کے آئے دن کے استعمال کے بغیر جس کا خطرہ انارکسٹ حکومت میں کہا جاتا ہے۔ آزادی حاصل کرنے کے لیے امید افزا ہے۔

نیشنل گلڈ لیگ کا پہلا پمفلٹ ان کے بڑے بڑے اصول پیش کرتا ہے۔ صنعت میں ہر فیکٹری چنے ہوئے منیجروں کے ذریعے اپنے پیداوار کے طریقوں پر انتظام کرنے میں آزاد ہو گی۔ ایک خاص صنعت کی مختلف فیکٹریاں ایک نیشنل گلڈ میں فیڈرائی جائیں گی جو نرخ وغیرہ اور صنعت کے دوسرے مفاد کی ذمہ دار ہو گی حکومت برادری کے ٹرسٹی کی حیثیت سے پیداوار کے ذرائع کی مالک ہو گی۔ گلڈز ان کا بندوبست برادری کی حیثیت سے کریں گے۔ اور سلطنت کو کرایہ یا ٹیکس دیا کریں گے۔ جو کوئی گلڈ برادری کے مفاد پر ذاتی غرض کو ترجیح دے گا۔ امانت میں خیانت کا مرتکب ہو گا اور اسے ثالثوں کے فیصلہ کے سامنے جھکنا پڑے گا۔ جو پیدا کرنے والوں اور گاہکوں کی ساری جماعت کے نمائندہ ہوں گے۔ سب سے بڑی جماعت اور صنعت کی آخری اپیل کورٹ یہی مشترکہ کمیٹی ہو گی۔ یہ نہ صرف گلڈ ٹیکس مقرر کرے گی۔ بلکہ معیاری قیمتیں بھی اور معیار کے بعد ٹیکس اور نرخ کو ترتیب دیا کرے گی ہر گلڈ اپنے دوسرے ساتھیوں کو مرضی کے مطابق آمدن کا حصہ دینے کے لیے بالکل آزاد ہو گا۔ اس کے ساتھ وہی ہوں گے۔ جو اس صنعت میں کام کرتے ہوں گے۔ گلڈ کی اس مجموعی آمدنی کو تقسیم کرنا ایسا معاملہ ہے۔ جو ہر گلڈ کے خود فیصلہ کرنے والا ہے۔

گلڈ سوشلزم' سنڈیکلزم سے یہ خیال لیتی ہے کہ آزادی حکومت کو مالک بنا دینے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ حکومت اور میونسپلٹی مالک کی حیثیت سے پرائیویٹ سرمایہ دار کی بہنیں ہیں۔ گلڈ سوشلسٹ سمجھتے ہیں کہ حکومت خریدار ہو گی۔ اور گلڈ پیدا کرنے والے اس طرح پارلیمنٹ اور کانگریس دو متحدہ مساوی طاقتیں گاہک اور مال تیار کرنے والوں کی نمائندگی کریں گی۔ دونوں کے اوپر پارلیمنٹ اور کانگرس کی مخلوط

کمیٹی ہو گی۔ جو گاہک اور مال پیدا کرنے والوں کے معاملات کا فیصلہ کرے گی۔ گلڈ سوشلسٹوں کا نظریہ ہے کہ سٹیٹ سوشلزم لوگوں کو محض گاہک اور سنڈیکلزم محض مال تیار کرنے والے سمجھتی ہے وہ کہتے ہیں کہ "سوال دونوں نقطہ نگاہوں میں سمجھوتے کا ہے اور یہی نیشنل گلڈ کرنے کو اٹھے ہیں۔ سنڈیکلزم مال پیدا کرنے والوں کی صنعتی جماعتوں کے لیے سب کچھ مانگتی ہے اجتماعیت گاہکوں کی سیاسی یا ملکی آرگنائزیشنوں کے لیے اور دونوں پر وہی اعتراض آتا ہے کہ ایک کو رد کر دینے سے تم دو باتوں میں سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔" لیکن ہر چند گلڈ سوشلزم دو برابر کے خیالوں میں موافقت کی کوشش ظاہر کرتی ہے اس کا جذبہ اور وقعت سنڈیکلزم سے لیے ہوئے ہیں۔ اس کی طرح وہ شروع میں کام کا اچھا معاوضہ نہیں چاہتی۔ لیکن دوسروں کے ساتھ کام کو دلچسپ اور زیادہ جمہوری بنا کر اس نتیجہ پر پہنچنا چاہتی ہے---- سرمایہ داری نے کام کو بالکل تجارتی رنگ دے کر اسے بے روح اور غیر دلچسپ کر دیا ہے۔ لیکن چند اشخاص کے نفع کو گلڈوں کی قومی خدمت سے بدل دو۔ قابل فروخت جنس کو ذمہ دار محنت سے بدل دو۔ موجودہ حکومت کی دفتر شاہی تباہ کن وسعت اور جدید مشترکہ کمپنی کو خودمختاری اور بے مرکزی سے بدل دو۔ پھر محنت میں مسرت کی آواز سنی جا سکتی ہے اور امید کی جا سکتی ہے کہ لوگ اپنے کام میں کمیت پر نہیں کیفیت پر ناز کریں گے۔ ایک وسطی زمانے کی بڑ ہے اور ایک "محنت میں مسرت" کا نعرہ۔ اور یہ اچھا ہے کہ اس بڑ کو مٹنے دیا جائے نہ کہ اپنے آپ کو سرمایہ داری اور اجتماعیت کے فلسفہ کے آگے جھکا دیا جائے۔ جو لکھتے ہیں کہ کام ایک لازمی برائی ہے جسے خوشگوار نہیں کیا جا سکتا اور مزدوروں کی امید صرف ایک فراغت ہے جو میونسپل آسائشوں سے سجائی ہوئی اور مالا مال ہو گی۔

سنڈیکلزم کے قابل عمل ہونے کے متعلق کچھ بھی کہا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ جو تصورات اس نے دنیا کے سامنے رکھے ہیں۔ انہوں نے مزدور تحریک کو نئی

زندگی دینے اور بعض ایسی بنیادی اہمیت والی باتوں کی طرف توجہ دلانے میں بہت مدد دی ہے۔ جسے وہ بھول جانے کو تھی۔ سنڈیکلسٹ انسان کو خریدار نہیں مال پیدا کرنے والا سمجھتے ہیں۔ ان کی توجہ کام کی بہتری کی نسبت اس میں آزادی حاصل کرنے کی طرف زیادہ ہے۔ انہوں نے آزادی کی اس تڑپ کو پھر زندہ کر دیا ہے جو پارلیمانی سوشلزم کے زیر اثر دھیمی ہوتی جاتی تھی۔ انہوں نے لوگوں کو یاد دلا دیا ہے کہ موجودہ سوسائٹی میں کہیں کہیں پچر لگانے کی نہیں' بنیادی تجدید کی ضرورت ہے۔ دباؤ کے تمام اسباب جلا دینے کی ضرورت ہے۔ انسان کی تعمیری قوتوں کو آزاد کرنے اور پیداوار اور معاشی تعلقات کو نباہنے اور نئے انداز نگاہ کی ضرورت ہے۔ یہ خوبی اتنی بڑی ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے تمام چھوٹے چھوٹے نقصان ماند پڑ جاتے ہیں اور سنڈیکلزم میں یہ خوبی زندہ رہے گی۔ ہر چند ایک مستقل تحریک کی حیثیت سے یہ جنگ کے ساتھ بہہ جائے گی۔

چوتھا باب

کام اور اجرت

سوسائٹی کو نیا اور بہتر روپ دینے کی راہ میں دو رکاوٹیں ہیں۔ ایک قدرت اور دوسرا خود انسان۔ واضح الفاظ میں سائنس قدرت کی رکاوٹوں سے نپٹتی ہے اور سیاست اور مجلسی تنظیم انسانوں کے اپنے بچھائے ہوئے کانٹے ہٹانے کے طریقے ہیں۔

معاشیات کی یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قدرت اپنے خزانے محنت کے سامنے اگلتی ہے۔ اپنی ضرورتوں کی تسکین کے لیے تھوڑی بہت محنت کی ضرورت اس لیے ہی نہیں کہ سیاسی نظاموں یا مزدور جماعتوں کو اپنے مطلب کے لیے استعمال کیا جا سکے بلکہ ان طبعی قانونوں کے سبب ہے جنہیں دوسروں کی طرح اصلاح کرنے والے خود بھی تسلیم کرتے اور مانتے ہیں۔ پھر اس سے پہلے کہ کوئی پر امید معاشی سکیم قابل عمل مان لی جائے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ آیا پیداوار کی طبعی حالتیں نہ تبدیل ہونے والی ہیں۔ یا سائنس اور تنظیم اسے بہت حد تک لچک دے سکتی ہیں۔ اس کے لیے ہمیں دو نظریوں پر غور کرنا ہو گا۔ ایک ماستھس کا نظریہ آبادی اور دوسرا دھندلا۔ لیکن زیادہ رواج پایا ہوا خیال کہ زندگی کی خالص ضرورتوں سے بڑھ کر زائد مصنوعات صرف لوگوں کے زیادہ گھنٹوں تک کام کرنے سے ہی پیدا کی جا سکتی ہیں۔ جو روکھا پھیکا اور دکھ دینے والا ہونے کے علاوہ مہذب زندگی یا معقول تفریح کے لیے کوئی وقت نہیں چھوڑتا۔ میرا خیال ہے ذرا گہری نظر سے دیکھیں تو امید کی راہ میں کوئی غبار اور رکاوٹ نہیں ہے۔ پیداوار کے طریقوں میں ٹیکنیکل ترقی اتنی تیزی سے ہو رہی ہے کہ آئندہ

صدیوں میں اجناس کی ترقی اور محنت کے اوقات کی کمی کے باعث عام خوشحالی کی راہ میں کسی اٹل رکاوٹ کا امکان نہیں۔

کروپا ٹکن نے خصوصیت کے ساتھ اس مضمون کامطالعہ کیا اور اس کی عام سیاسی تھیوریوں کے متعلق کچھ بھی کہا جائے: زراعت کی ترقیوں کے متعلق کچھ بھی کہا جائے۔ زراعت کی ترقیوں کے متعلق اس کے خیالات پر از معلومات ٹھوس اور قائل کر دینے والے ہیں۔ سوشلسٹ اور انارکسٹ زیادہ تر صنعتی زندگی کی پیدائش ہیں اور ان میں سے بہت کم کو خوراک پیدا کرنے کے موضوع کا عملی علم ہے۔ لیکن کروپا ٹکن ایک ایسی مثال ہو سکتا ہے اس کی دو کتابیں Conquest اور Field, Factores & Workshops of Bread لمبی چوڑی معلومات سے پر ہیں۔ اور امید کے لیے کھلا میدان پیدا کرتی ہیں۔ میرے خیال میں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں ایسے امکانات کا ذکر ہے۔ جنہیں ہم کبھی ماننے کو تیار نہیں تھے۔

ماستھس کا خیال ہے کہ آبادی ہمیشہ سامان زندگی کے مطابق بڑھا کرتی ہے اور اس کی کثرت کے ساتھ ساتھ خوراک کی پیداوار مہنگی ہو جاتی ہے۔ اس لیے بعض خاص وقفوں کو چھوڑ کر جب نئی ایجادیں عارضی تسکین پیدا کر دیتی ہیں۔ انسانوں کا انبوہ نسلی زندگی کی ضرورت سے کبھی زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ مہذب قوموں کے متعلق تو یہ نظریہ شرح پیدائش میں زبردست گراوٹ کے باعث غلط ثابت ہو رہا ہے۔ لیکن اس گراوٹ کے علاوہ بھی کم از کم مستقبل قریب کے متعلق اسے نہ ماننے کی کئی دلیلیں ہیں۔ ماستھس کی تصنیف کے بعد کی صدی میں تمام مزدور جماعتوں میں آسائش کا معیار بہت بڑھ گیا اور محنت کی بار آور میں زیادہ ترقی کے باعث اس سے بھی زیادہ آسائش حاصل ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ تقسیم کا زیادہ باانصاف طریقہ رائج کیا جا سکتا ہے۔ پہلے زمانوں میں جب ایک آدمی کی محنت اس کی اپنی ضروریات سے زیادہ نہ پیدا کر سکتی تھی۔ محنت کے عام اوقات گھٹا دینا یا اس آبادی کے تناسب کو بڑھا دینا جو عام ضروریات

زندگی سے بڑھ کر خوشیاں مناتی تھی ناممکن تھا۔ لیکن پیداوار کے جدید طریقوں نے یہ سب کچھ ممکن کر دیا ہے۔ پچھلے چند سالوں میں نہ صرف بہت سے لوگوں نے سود یا کرایہ سے خوب نفع اٹھایا۔ بلکہ مہذب ممالک کی نصف کے قریب آبادی اجناس کی پیداوار میں نہیں۔ بلکہ لڑنے مرنے یا سامان جنگ تیار کرنے میں مصروف رہی ہے۔ امن کے وقت یہ نصف بیکار رہیں تو بھی باقی دنیا اس سے زیادہ غریب نہیں ہو سکتی۔ جس قدر جنگ کے چھڑے رہنے میں ہو سکتی ہے اور اگر..... بیکار رہنے کی جگہ انہیں کچھ کرنے پر لگا دیا جائے۔ تو جو کچھ وہ پیدا کریں گے۔ موجودہ اجرتوں سے زائد ہو گا۔ برطانیہ میں محنت کی موجودہ پیداواری قوت روزانہ ایک پونڈ کے قریب آمدنی ہر ایک کنبے کو دے سکتی ہے۔ خواہ ذرائع میں وہ ترقی نہ بھی ہو جو جلد ہونے والی ہے۔

لیکن یہ کہا جائے گا کہ آبادی کے بڑھنے کے ساتھ خوراک کی قیمت بھی انجام کار بڑھنی لازمی ہے۔ جس وقت کینیڈا، ارجنٹائن، آسٹریلیا اور دیگر جگہوں میں سپلائی کے چشمے سوکھتے جائیں گے—— یاس نظر کہتے ہیں—— ایک وقت آئے گا۔ جب خوراک اتنی مہنگی ہو جائے گی کہ معمولی مزدور کے پاس دوسری اشیاء خریدنے کے لیے کچھ نہیں رہ جائے گا۔ یہ ممکن ہے کہ اگر آبادی کو بے لگام بڑھنے دیا جائے تو کہیں مستقبل بعید میں ایسا ہی ہو اور اگر دنیا کی ساری سطح اسی قدر گنجان آباد ہو۔ جس قدر آج لندن ہے تو بچے کھچے ٹکڑوں پر کاشت کرکے ضروری خوراک پیدا کرنے کے لیے آبادی کی ساری محنت کو کام میں لانا پڑے گا۔ لیکن یہ گمان کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ آبادی بے حساب بڑھتی جائے گی اور ایسا گمان کرنا اتنی دور کی کوڑی لانا ہے کہ تمام عملی امور میں اسے نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔

ان دھندلی ٹامک ٹوئیوں سے کروپاٹکن کے حقائق کی طرف آتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ زیادہ کاشت کے ذریعوں سے جو آج بھی برتے جاتے ہیں۔ ایک خاص رقبہ میں خوراک کی مقدار اس سے بہت زیادہ پیدا کی جا سکتی ہے۔ جس قدر لاعلم لوگ ممکن

سمجھتے ہیں۔ برطانیہ' پیرس کے نواح اور دوسری کئی جگہوں میں فروخت کے لیے سبزیاں بونے والوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے: انہوں نے بالکل نئی کاشت ایجاد کر لی ہے۔ جب ہم اس پرانے نظام پر اینڈتے ہیں۔ جس سے ہر سال ایک فصل یا ہر سال میں چار فصلیں حاصل ہو سکتی ہیں۔ وہ مسکرا دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے ارادے اس زمین سے ہر سال بھر میں چھ یا تو فصلیں لینے کے ہیں۔ وہ ہمارا اچھی یا بری زمین کا رونا نہیں سن سکتے۔ کیونکہ وہ خود زمین کو بناتے ہیں..... وہ فصلیں چاہتے ہیں۔ ہماری طرح ایکڑ زمین سے پانچ چھ ٹن گھاس نہیں۔ بلکہ پچاس یا سو ٹن مختلف سبزیاں لیتے ہیں۔ پانچ پونڈ کا سوکھا ہوا گھاس نہیں۔ بلکہ مولیوں اور گاجروں کی کوئی سو پونڈ کی مختلف سبزیاں۔

مویشیوں کے متعلق وہ کہتا ہے کہ وبٹی کے مقام پر مسٹر ٹھمپسن ہر ایکڑ میں دو یا تین مویشیوں کا چارہ پیدا کر لیتا ہے اور معمولی اعلیٰ کھیتی باڑی کے ماتحت برطانیہ میں ایک مویشی کے لیے دو یا تین ایکڑ زمین درکار ہے۔ اس سے بھی حیرت انگیز کارنامے پیرس کے نواح میں دیکھے گئے ہیں۔ ان کو خلاصہ کرکے لکھنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن ہم عام نتیجہ نقل کر دیتے ہیں: آپ وہاں عملی کاشتکار ہیں۔ جو دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر 35 لاکھ باشندوں کے لیے خوراک اور مویشیوں کے لیے نباتات ان کے رقبے میں پیدا کرنی پڑے جو 3250 مربع میل ہے تو وہ ایسا کر سکتے ہیں اور اپنے مروجہ کاشتی طریقوں کے ساتھ جو بڑے پیمانے پر آزمائے گئے۔ اور کامیاب نکلے ہیں۔ آگے چل کر کروپا ٹکن وہ طریقے بتاتا ہے۔ جن کے ذریعے زیادہ عرصہ محنت کے بغیر بھی وہی نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کھیتی باڑی کے زیادہ کام وہ لوگ سنبھال سکتے ہیں۔ جن کے کاروبار دفتری ہیں اور صرف اتنے وقت کے صرف کرنے سے جو ان کی صحت کو برقرار رکھ سکے۔ اور خوشگوار تبدیلی پیدا کرے۔ وہ تقسیم کار کی تھیوری کے خلاف ہے اور یگانگت چاہتا ہے۔ ایک سوسائٹی جس میں ہر مرد جسمانی اور دماغی کام کرنے والا ہو جس میں ہر صحیح دماغ انسان ایک مزدور اور جہاں ہر کام کرنے والا کھیتوں اور صنعتی کارخانوں میں

کام کرے۔

ان خیالات کا کروپاٹکن کی انارکزم سے کوئی ضروری تعلق نہیں ہے۔ سٹیٹ سوشلزم میں بھی یوں ہو سکتا ہے اور بعض حالات میں سرمایہ داری نظام میں بھی۔ ہمارے موجودہ مقصد کے لیے وہ بہت مفید ہیں۔ لیکن اس لیے نہیں کہ کسی ایک معاشی نظام کے موافق یا مخالف ہیں۔ بلکہ اس لیے کہ ہماری امیدوں کے سر سے اس بوجھ کو ہٹا دیتے ہیں۔ جو محنت کی پیداواری قابلیت کے متعلق شک ہو جانے سے ہماری گردن توڑ دے۔پیداوار کی خالص فنی اور مادی طرف سے ہٹ کر اب ہم ان باتوں کی طرف آتے ہیں۔ جو انسانوں کو پیداوار کی طرف آمادہ کرتی ہیں۔ اور پیداوار کی موثر تنظیم کے امکانات اور تقسیم کے ساتھ اس کے تعلق پر غور کرتے ہیں۔ موجودہ نظام کے حمایتی کہتے ہیں کہ مالی ترغیبات کے بغیر کام ناممکن ہو جائے گا اور اگر اجرت کا طریقہ اڑا دیا گیا تو کافی لوگ کام کرنے سے باز رہیں گے۔ اور برادری کو مناسب آسائش نہ مل سکے گی۔ مالی انگیخت کی مسلمہ ضرورت سے پیداوار اور تقسیم کا سوال ایک ہو جاتا ہے۔ سوشلزم اور انارکزم دونوں میں دنیاوی سامان کی زیادہ منصفانہ تقسیم کی آرزو دھڑکتی ہے۔ اس لیے ہمیں سوچنا چاہیے کہ کیا ان کے بتائے ہوئے تقسیم کے طریقے پیداوار کو سچ مچ گھٹا دیں گے؟

سوشلزم اور انارکزم میں تقسیم کے متعلق ایک بنیادی اختلاف ہے۔ سوشلزم اپنی اکثر حالتوں میں کیے ہوئے کام یا کام کی رضامندی کے لیے اجرت قائم رکھنا چاہتی اور سوائے ان لوگوں کے جو عمر یا کمزوری کے سبب ناقابل ہوں۔ کام کے لیے آمادگی کو معاش یا بہت پست مقدار سے بلند معاش کے لیے شرط ٹھہراتی ہے۔ مگر انارکزم ہر ایک کو بغیر کسی شرط کے اس کی ضرورت کے مطابق چیزیں مہیا کرتا اور زیادہ کمیاب جنسیں جن کی بہم رسانی آسانی کے ساتھ بہت زیادہ نہیں بڑھ سکتی۔ آبادی میں برابر حساب سے بانٹ دینا چاہتی ہے اور کام میں جبر نہیں آنے دیتی۔ انارکسٹ یقین

رکھتے ہیں کہ آبادی کی بڑی اکثریت کے لیے کام اس قدر قابل قبول بنایا جا سکتا ہے کہ لوگ رضاکارانہ کرنے لگیں۔ اس کے برعکس سوشلسٹ جبری کام کے حامی ہیں۔ ان میں سے بعض تمام مزدوروں کی تنخواہیں برابر کہتے ہیں اور بعض اسی کام کے لیے زیادہ اجرت قائم کرتے ہیں۔ جسے وہ زیادہ اہمیت والا سمجھیں۔ یہ تمام مختلف طریقے زمین اور سرمایہ کی ساجھی ملکیت کے ساتھ میل کھا سکتے ہیں۔ اگرچہ ان سب میں سماج کی ہیئت کے متعلق بہت اختلاف ہے۔

کام کے لیے مالی ترغیب کا جہاں تک تعلق ہے۔ غیر مساوی اجرت کے ہوتے ہوئے سوشلزم آج کی سوسائٹی سے بہت مختلف نہ ہو گی۔ تاہم جو فرق ہو گا۔ وہ ہمارے موجودہ نقطہ نگاہ سے بلاشبہ ہماری بہتری کے لیے ہو گا۔ موجودہ نظام کے ماتحت بہت سے لوگ زمین یا سرمایہ کو ترکہ میں پانے کے باعث بیکاری اور تن آسانی کا لطف لیتے ہیں۔ کئی معاشیات یا صنعت میں سرگرمیوں کے سبب اس قدر تنخواہ پاتے ہیں۔ جو یقیناً" اس سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ جس کے سماجی مفاد کے لحاظ سے وہ حقدار ہوتے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایجادیں کرنے والے جن کے کام زیادہ مجلسی بہبود کے ہوتے ہیں۔ سرمایہ داروں کے ہاتھوں یا عوام کے اسے بروقت نہ سراہنے سے اپنے انعام سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اچھی اجرت کا کام صرف انہیں مل سکتا ہے جو زیادہ خرچ سے ٹریننگ حاصل کرنے کے قابل ہوں اور یہ لوگ بھی زیادہ تر لیاقت سے نہیں قسمت سے چنے جاتے ہیں۔ مزدور کو کام کی رغبت پر نہیں کارخانہ دار کی فلاح کے عوض میں اجرت ملتی ہے۔ چنانچہ ممکن ہے کہ وہ ان اسباب کے باعث جن پر اس کا کچھ اختیار نہیں ہے۔ تباہی کے گڑھے میں گر پڑے۔ یہ تباہی ایک مستقل خطرہ ہے اور جب آتی ہے ناروا تکلیف لاتی ہے۔ بسا اوقا دکھ دیکھنے والے کی سماجی ساکھ کو مٹا کر رکھ دیتی ہے۔ پیداوار کے نقطہ نگاہ سے یہ ان داغوں میں سے چند ہیں۔ جن سے ہمارا موجودہ نظام لالہ زار ہے۔ اور ان سب خرابیوں کے علاج کی توقع

سوشلزم سے کی جا سکتی ہے۔

یہ جاننے کے لیے کہ کام میں کہاں تک انگیخت کا دخل ہے۔ دو سوالات پر غور کرنا ضروری ہے۔ اول یہ کہ کیا باہنر اور سماجی لحاظ سے زیادہ مفید کام کے لیے زیادہ تنخواہ دینی چاہیے تاکہ وہ زیادہ مقدار میں ہو سکے؟ دوسرا کیا کام اتنا دلچسپ بنایا جا سکتا ہے کہ اگر بیکاروں کو بھی پیداوار میں مساوی حصہ دیا جائے۔ تو بھی ضرورت کے مطابق کافی کام ہو سکے؟ ان میں سے پہلے سوال نے سوشلسٹوں کو دو گروہوں میں کر دیا ہے۔ میانہ رو بعض اوقات تسلیم کرتے ہیں کہ سوشلزم میں بھی مختلف کاموں کے لیے مختلف اجرتیں اچھی رہیں گی۔ جبکہ انتہا پسند تمام مزدوروں کے لیے مساوی تنخواہیں تجویز کرتے ہیں۔ دوسرا سوال سوشلسٹوں اور انارکسٹوں میں تفریق کا باعث ہے۔ انارکسٹ کام نہ کرنے پر کسی کو اجناس سے محروم نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن سوشلسٹ عمومی طور پر ایسا کرتے ہیں۔

ہمارا دوسرا سوال پہلے سے زیادہ بنیادی ہے۔ لہٰذا اسے پہلے بحث میں لانا چاہیے۔ اور بحث کے دوران میں پہلے سوال کا ذکر بھی قدرتی طور پر آ جائے گا۔

اجرت یا آزاد شراکت؟

اجرتی نظام کا خاتمہ انارکسٹوں اور انتہائی سوشلسٹوں کا مشترکہ نعرہ ہے لیکن حقیقی معنوں میں اس کا حق صرف انارکسٹوں کو ہے۔ انارکسٹی سماج میں تمام عام اجناس ہر ایک کو بلاتمیز جس طرح آج پانی دستیاب (1) ہوتا ہے۔ اس نظام کے علمبردار کہتے ہیں کہ آج بھی یہ طریقہ اکثر ان چیزوں پر برتا جاتا ہے جن کے لیے پہلے قیمت ادا کرنی پڑتی تھی۔ مثلاً سڑکیں اور پل وغیرہ۔ وہ کہتے ہیں کہ اسے بڑی آسانی کے ساتھ ٹراموں اور مقامی گاڑیوں تک پھیلایا جا سکتا ہے۔ وہ دلیل دیتے ہیں کہ تمام زیادہ عام خوراکیں ہر ایک کو مہیا کی جا سکتی ہیں۔ کیونکہ انہیں ہر ممکن مانگ کے لیے کافی مقدار میں پیدا

کرنا بہت آسان ہو گا۔ اگر یہ طریقہ تمام ضروریات زندگی پر حاوی کر دی جائے۔ تو ہر ایک کے نان نفقہ کا انتظام اس سے بے نیاز ہو کر کہ وہ کس طرح دن کاٹتا ہے ہو جائے گا۔ وہ جنسیں جو بے شمار پیدا نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً عیش و نفاست کے سامان انارکسٹوں کے مطابق بلاقیمت تقسیم کیے جائیں گے لیکن تناسب کے ساتھ حاصل شدہ مقدار ساری آبادی مین برابر بانٹ دی جائے گی۔ لیکن اگرچہ یہ نہیں کہا گیا۔ پھر بھی ایسے عیش و نفاست کے سامان پر قیمت سے ملتا جلتا کچھ نہ کچھ مقرر کرنا ہی پڑے گا۔ تاکہ ایک انسان کو اختیار ہو کہ جو چاہے لے سکے---- ایک اچھی شراب کو پسند کرتا ہے دوسرا سگار کو۔ کوئی تصویریں یا خوبصورت فرنیچر لازمی طور پر ہر ایک کو اسی قدر مہیا کیا جا سکے جس قدر اس کا حق ہے۔ لیکن جس رنگ میں وہ پسند کرے۔ تناسبی قیمتیں مقرر کر دی جائیں گی تاکہ مانگ میں مساوات ہو جائے۔ ایسی دنیا میں پیداوار کے لیے مالی محرک بالکل مٹ جائے گا۔ اور کام کو جاری رکھنے کے لیے نئے محرک ڈھونڈھنے پڑیں گے۔

کیا ایسا نظام ممکن ہے؟ کیا فنی لحاظ سے یوں ہو سکتا ہے کہ زندگی کی ضرورتیں اس مقدار میں مہیا کی جائیں کہ ہر مرد عورت خواہش کے مطابق بہرہ مند ہو سکے؟

خرید و فروخت کا خیال ایسا مانوس ہو چکا ہے کہ اسے اڑا دینے کی تجویز پہلے پہل مجنونانہ سمجھی جائے گی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ اس قدر مجنونانہ نہیں جس قدر نظر آتی ہے۔ اگر ہم سب کو روٹی مفت مل جائے تو بھی ہم ایک خاص مقدار سے زیادہ نہیں چاہیں گے امیروں کی خوراک کا خرچ ان کی آمدن کے سامنے اتنا کم ہے کہ ان کے خرچ پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ اس کے باوجود جس قدر وہ خوراک پر خرچ کرتے ہیں۔ آسانی کے ساتھ نئے طریقوں سے ساری آبادی کو مہیا کی جا سکتی ہے (لیکن میں جنگ کے دنوں کی بات نہیں کر رہا) لوگ ایک خاص مقدار سے زیادہ خوراک نہیں چاہتے۔ اس لیے زیادہ مقدار ضائع نہیں جا سکتی۔ جیسا کہ انارکسٹ کہتے ہیں۔ آج

لوگوں کے لیے پانی عام ہے لیکن بہت کم لوگ اس کے باوجود نلکوں کو یوں ہی کھلے پڑے رہنے دیتے ہیں۔ اور امید کی جا سکتی ہے کہ لوگ زیادہ ضائع کرنے کے خلاف ہوں گے۔ میرے خیال میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ غیر محدود بہم رسانی کا اصول ان تمام جنسوں کے بارے میں اپنا بنایا جا سکتا ہے جن کی مانگ کی حدود آسانی کے ساتھ ساتھ پیدائش کے اندر اندر رہیں۔ اور یہی کیفیت دیگر ضروریات زندگی کی ہے---- اس میں تعلیم بھی شامل ہے----- اگر انہیں خوب منظم کر لیا جائے۔ تعلیم کو تمام تر مفت کر دینے سے بھی نوجوان اگر ان میں انارکسٹوں نے نئی روح نہیں پھونک دی۔ ایک خاص مقدار سے زیادہ نہ چاہیں گے اور یہی حالت عام خوراک پوشاک اور دوسری ان چیزوں کی ہے۔ جو ہماری ابتدائی ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔

میرے خیال میں یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ انارکسٹوں کی آزاد شرکات کی تجویز غیر ممکن نہیں ہے---- لیکن اگر کام کرنے کے بغیر بھی آسائش کا ملنا یقینی ہو تو کیا ضرورت کے مطابق کام ہو جایا کرے گا؟

اکثر لوگ بلا جھجک "نہیں" کہہ دیں گے۔ خصوصاً" وہ جو اپنے ملازموں کو کاہل الوجود کہہ کہہ کر کوسنے کے عادی ہیں۔ پورا یقین رکھیں گے کہ برطرفی اور مسلسل فاقہ کے ڈر کے بغیر ان سے کوئی کام نہیں لیا جا سکے گا۔ لیکن کیا ایسا ہی ہے۔ جیسا کہ پہلی نظر میں دکھائی دیتا ہے؟ اگر کام آج کا سا کام رہے۔ تو بلاشبہ مفلسی کے خوف کے بغیر لوگوں کو کام کے لیے ابھارنا بہت دشوار ہو گا۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ کام آج کا سا روکھا پھیکا اور بھیانک رہے۔ (2) اگر لوگوں کو کام کی طرف ہانکنے کی نسبت محض اکسانا پڑے۔ تو جماعت کا صاف صاف مفاد کام کو خوشگوار بنانا ہو جائے گا۔ جب تک کام بالکل خوشگوار نہیں بنایا جاتا۔ سوسائٹی اچھی سوسائٹی نہیں کہی جا سکتی پھر کیا ایسا ممکن ہے؟

آج زیادہ اجرت والا کام---- کاروباری اور نوکری پیشہ جماعتوں کا---- بہت

حد تک لطف آمیز ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان کا ہر لمحہ سہانا ہے۔ البتہ اس قسم کا کام کرنے والی کی زندگی مجموعی طور پر اس سے شاداب ہوتی ہے۔ جو پاؤں پسارے اسی قدر پیسے بٹور لیتا ہے۔ باہمت لوگوں کے لیے اگر وہ اپنی دماغی صحت اور زندگی ی امند کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ تھوڑا بہت کام اور کچھ نہ کچھ مصروفیت بہت ضروری ہے۔ کام کی کافی مقدار بلامعاوضہ کی جاتی ہے۔ جو لوگ فطرت کا شگفتہ پہلو لیتے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ مجسٹریٹ کے فرائض نالیاں صاف کرنے کی طرح ناپسندیدہ کاموں میں سے ہیں۔ لیکن تاریک پہلو دیکھنے والا کہے گا کہ کینہ پروری اور اخلاقی برتری کی مسرتیں اس قدر بڑی ہیں کہ ایسے اچھے خاصے ذات شریف باآسانی دیکھے جاتے ہیں۔ جو بغیر کسی معاوضہ کے بے سہارا بدبختوں کو جیل میں ٹھونس دینے پر آمادہ رہتے ہیں اور کام سے لطف لینے کے علاوہ پڑوسیوں کے نیک خیال اور بااثر ہونے کی آرزو بہت سے لوگوں کو مصروف عمل رکھنے کے لیے کافی ہے۔

لیکن کہا جا سکتا ہے کہ رضاکارانہ طور پر کام نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اکثر کام ایسے ہیں جن میں بہت تکلیف جھیلنا پڑتی ہے۔ سہل زندگی کو چھوڑ کر کون کوئلہ کھودنا پسند کرے گا۔ میرے خیال میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ بہت سا ضروری کام ہمیشہ ناگوار یا کم سے کم اکتا دینے والا ہی رہے گا اور انارکسٹ طریقے کو چلانے کے لیے ضروری ہے کہ ان کاموں کے کرنے والوں کو خاص مراعات دی جائیں۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ایسی مراعات کا اعلان انارکزم کی منجی ہوئی منطق کو خراب کر دے گا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس سے نظام میں کوئی زبردست شگاف پیدا نہیں ہو گا۔ بہت سا کام خیال اور احتیاط کے ساتھ خوشگوار بنایا جا سکتا ہے۔ آج بھی گھنٹوں کام کیے جانا ہی اسے گراں بنا رہا ہے۔ اگر کام کی اوسط وقت چار گھنٹے کر دی جائے۔ جیسا کہ بہتر تنظیم اور زیادہ سائنٹیفک طریقوں سے ممکن ہے تو کام کا بہت بڑا حصہ جسے آج بوجھ خیال کیا جاتا ہے۔ بوجھ نہیں رہے گا۔ جیسا کہ کروپا ٹکن تجویز کرتا ہے۔ اگر زرعی کام انجان لوگوں

کے سر عمر بھر تھونپ دینے کی جگہ جو سخت افلاس میں دن کاٹ رہے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کا وقتی مشغلہ بنا دیا جائے جو صنعت یا دماغی کام میں لگے ہوتے ہیں۔ اگر پرانے دقیانوسی طریقوں کی جگہ جن میں مزدوروں کی ذہنی شراکت کا کوئی امکان نہیں۔ اس میں نئے طریقوں اور نئی ایجادوں کی تلاش دھڑکتی ہے۔ آزادی کی روح مسکراتی ہو اور کام کرنے والوں کے جسمانی اور دماغی تعاون کو دعوت دے تو ممکن ہے کہ کام سرگرانی کی جگہ مسرت کا باعث بن جائے اور کرنے والوں کو صحت اور زندگی بخشے۔ انارکسٹ کہتے ہیں کہ جو بات زراعت پر ٹھیک آتی ہے۔ وہ صنعت کے بھی حسب حال ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر بڑے بڑے مالیاتی ٹرسٹ جن میں آج سرمایہ داروں کا دخل ہے اور جنہیں مزدوروں کی زندگی کا بہت کم احساس ہے۔ خودمختار جماعتوں میں بدل دیئے جائیں۔ جن میں کام کرنے والے خود ہی طریقوں' حالتوں اور وقتوں کے متعلق سوالات کا فیصلہ کر لیا کریں۔ تو زبردست خوشگوار تبدیلی ممکن ہے کدورت اور واویلا تقریباً ختم ہو جائے۔ صنعتی دنیا کی ہیبت ناکی حسن بن جائے۔ پیداوار کے سائنسی پہلوؤں میں دلچسپی ہر ایک کے دل میں ہو اور سارے کام میں کسی مصور کی تخلیقی مسرت مسکرانے لگے۔ آج جس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ کل اقتصادی خودمختاری سے ممکن ہو جائے۔ اس طرح کام اتنا دلچسپی ہو جائے گا کہ اسے بیکاری پر ترجیح دی جائے گی۔ دوسرے کاموں کے لیے امتیازی انعامات خواہ وہ سامان کی شکل میں ہوں یا اعزاز و مراعات کی شکل میں ان کو دیئے جائیں گے۔ جو ناگوار کام کو انجام دیں گے اور اس سے کوئی بنیادی اعتراض بھی نہیں آتا۔

اس میں شک نہیں کہ آبادی کا ایک خاص رقبہ بیکاری کو ترجیح دے گا۔ اور اگر وہ حصہ بہت قلیل ہوا تو کوئی حرج نہیں ہو گا۔ بیکار رہنے والوں میں فنکار' مصنف' دماغی کاموں میں لگے ہوئے لوگ۔۔۔۔۔ مختصراً وہ سب جنہیں جیتے جی سوسائٹی کوستی اور مر جانے پر پھول چڑھاتی ہے۔ شمار کیے جا سکتے ہیں۔ ان لوگوں کا اپنے خیال میں مگن رہنا

ہی سب سے بہتر ہے۔ جسے ان شاعروں کی خبر ہے۔ جنہیں روٹی کمانے کے لیے اور کام کرنے پڑے۔ اسے اس کا بھی احساس ہو گا۔ کہ ان کے کس قدر شاعرانہ جوہر محض افلاس کے باعث بڑھ نہ سکے اور یہ خیال حماقت ہے کہ امیر قدرت کی طرف سے بہتر شاعرانہ قابلیت لے کر آئے ہیں۔

اس وقت تک ہم نے انار کسٹی تجویز کی حمایت میں دلیلیں دی ہیں۔ میرے خیال میں ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تجویز چل سکتی ہے۔ لیکن پھر بھی یہ دلیلیں اتنی کافی نہیں کہ اس تجویز کو آزمانا دانشمندی سمجھا جائے۔

تقسیم کے بارے میں انارکسٹوں کی تجویزوں کے چل سکنے کا معاملہ دوسرے کئی سوالوں کی طرح مقدار پر مبنی ہے۔ انارکسٹ تجویزوں کے دو جز ہیں 1- عام اجناس ہر ایک کو مساوی ملنی چاہئیں۔ 2- کام کے صلے میں مالی انعام یا کسی قسم کی مجبوری نہیں ہونی چاہیے۔ یہ دونوں تجویزیں ایک دوسری سے پیوست نہیں ہیں۔ اور نہ ان میں سے کوئی ایک سارے انار کسٹی نظام کو ضروری کر دیتی ہے۔ اگرچہ ان کے بغیر انارکزم ناممکن ہے۔ پہلی تجویز تو آج بھی بعض جنسوں کے متعلق چلائی جا سکتی ہے اور کئی اور کے بارے میں مستقبل قریب میں چل سکتی ہے۔ کیونکہ اس میں ایک لچک ہے۔ اور کوئی بھی صرف کیے جانے والی چیز مفت کی فہرست پر درج کی جا سکتی اور وقت پڑے ہٹائی جا سکتی ہے۔ اس کے فائدے بہت ہیں۔ اور دنیا اس کی طرف جھک رہی ہے۔ میرے خیال میں انارکسٹ نظام کا یہ حصہ تھوڑا تھوڑا کرکے اپنایا جا سکتا ہے۔

لیکن دوسری تجویز کہ کام کی مجبوری نہیں ہونی چاہیے اور اس کے لیے کوئی مالی انعام نہ ہونا چاہیے۔ ذرا مبہم سی ہے۔ انارکسٹ ہمیشہ کہتے ہیں کہ جب ان کی سکیموں پر عمل شروع ہو جائے گا۔ ہر ایک شخص کام کیا کرے گا۔ لیکن ہرچند اس کی حمایت میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ بحث طلب ہے کہ عملی مقاصد میں یہ کامیاب بھی ہو سکتی ہے یا نہیں شاید کسی ایسی جماعت میں جہاں صنعت مالی ضرورت کے سبب عام

ہو چکی ہو۔ رائے عامہ میں اتنا زور ہو کہ وہ لوگوں کو کام کے لیے مجبور (3) کر سکے۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایسی صورت حالات کب تک رہے۔ رائے عامہ کے موثر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ جماعت کو چھوٹے چھوٹے ٹولوں میں بانٹ دیا جائے اور ہر ٹولے کو اس قدر خرچ کرنے کی اجازت ہو جس قدر وہ پیدا کرے۔ اس سے ٹولوں میں معاشی جذبہ بھی چل پڑے گا اور چونکہ ٹولے چھوٹے چھوٹے ہوں گے۔ اس لیے مجموعی طور پر بیکار افراد کا اثر بہت گھٹ جائے گا۔ ایسا طریقہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ انارکزم کی روح کے بالکل خلاف ہو گا۔ اور اس معاشی نظام کے بڑے بڑے اصول تباہ کر دے گا۔

پکے سوشلسٹوں کا رویہ اس بارے میں انارکزم سے بالکل جدا ہے۔ "اشتراکی اعلان" کی فوری تجویزوں میں محنت کا سب کے لیے مساوی ہونا اور زراعت وغیرہ کے لیے "صنعتی فوجوں کا قیام" کا پرچار کیا گیا ہے۔ سوشلسٹ نظریہ یہ ہے کہ صرف کام ہی حق بخشتا ہے کہ کام کی پیداوار سے بہرہ مند ہو جائے۔ البتہ بوڑھے، کمسن، کمزور اور وہ جن کے کام کی عارضی طور پر ضرورت نہ ہو مستثنیٰ سمجھے جا سکتے ہیں۔ لیکن سوشلزم کا بنیادی تصور زیرِ بحث سوال کے متعلق یہی ہے کہ جو کر سکتے ہیں۔ انہیں کام کے لیے مجبور کرنا چاہیے خواہ فاقہ کے دھمکاوے سے یا تعزیرات کے ذریعے اور کام وہی تسلیم کیا جائے گا۔ جسے ذمہ دار افسر پسند کریں۔ سوشلزم یا حکومت وقت کے نظریوں کے خلاف کتابیں لکھنا کام نہیں سمجھا جائے گا اور نہ ہی رائل اکیڈیمی سے جدا طرز کی تصویریں یا سنسر کے محکمہ کو نہ بھانے والے ڈرامے، خیال کی ہر نئی روش روک دی جائے گی۔ جب تک اثر و رسوخ یا رشوت کے ذریعے عالموں کی خوشنودی حاصل نہ کی جائے۔ ان نتائج پر سوشلسٹوں کی نظر نہیں۔ کیونکہ وہ خیال کرتے ہیں کہ سوشلسٹ حکومت ان جیسے لوگ چلائیں گے جو آج اس کا پرچار کر رہے ہیں---- اور یہ ایک بھول ہے۔ اس وقت حکومت کے ارکان موجودہ سوشلسٹوں سے اسی

قدر کم مشابہ ہوں گے۔ جس قدر قسطنطنیہ سے بعد کے پادری مسیح کے حواریوں سے جو لوگ ایک غیر مانوسی اصلاح کا پرچار کرتے ہیں۔ خدمت خلق کے لیے بے لاگ اور پرجوش ہونے میں اپنی مثال ہوتے ہیں۔ لیکن جو اصلاح کے بعد حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لیتے ہیں اور زیادہ تر اسی حرص و ہوا کے پتلے ہوتے ہیں۔ جو تمام صدیوں اقوام کی حکومت پر چھائی رہی اور ان لوگوں سے آزادی کی حمایت یا مخالفت کی برداشت کبھی نہیں دیکھی گئی۔

ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انارکسٹ اور سوشلسٹ دونوں تجویزیں مساوی خطرات رکھتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ جو خرابیاں ہم سوشلزم میں دیکھتے ہیں۔ وہ آج بھی موجود ہیں۔ لیکن سوشلسٹوں کا مقصد تو موجودہ دور کی خرابیوں کا علاج کرنا ہے۔

انارکزم میں آزادی اور سوشلزم میں کام کی ترغیب کی خوبی ہے۔ پھر کیا ہم ان دونوں خوبیوں کو سمجھ سکتے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے۔

ہم نے دیکھا تھا کہ اگر زیادہ لوگ اوسطاً" کام کریں۔ اور ان کا کام تنظیم اور سائنس کے سہارے زیادہ بارور بنا دیا جائے۔ تو کوئی معقول وجہ نہیں کہ زندگی کی ضرورتیں سب کو مفت مہیانہ کی جا سکیں۔ ہمیں یہی ڈر تھا کہ کسی انارکسٹی نظام میں کام کے لیے محرک نہ ملنے کے باعث بیکاری خطرناک مقدار میں نہ ہو جائے۔ لیکن اس کا جواب بڑا سہل ہے کہ اگرچہ ابتدائی ضروریات مفت پورا ہوا کریں گی۔ لیکن اس کے علاوہ انہی کو ملے گا۔ جو کام کرنے پر آمادہ ہوں گے۔ آج کی طرح ان ہی کو نہیں جنہوں نے کسی وقت کام کیا ہوگا۔ بلکہ ان سب کو جن کی بیکاری میں ان کا اپنا ہاتھ نہ ہو گا۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص جو اپنے اخراجات سے بہت کم بچا سکتا ہے۔ رنگ رلیوں کی خاطر نئے بااجرت کاموں کو ہمیشہ ترجیح دیتا ہے۔ یہی کیفیت ہمارے نظام کی ہو گی۔ اس کے ساتھ ہی جو شخص آرٹ' سائنس یا تخیل کے نامعلوم کام میں

دلچسپی محسوس کرے گا۔ اسے اس کے لیے آزادی ہو گی۔ بشرطیکہ وہ رنگ رلیوں سے بے تعلقی اور جفاکش زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہو۔ بعض ایسے لوگ جو کام سے جی چراتے اور آوارہ ہو جاتے ہیں۔ بے خطر زندگی بسر رک سکتے ہیں۔ اس طرح آزادی کے دعویٰ کو کام کے لیے کچھ نہ کچھ مالی محرک کی ضرورت کے ساتھ سمویا جا سکتا ہے۔ اور میرے خیال میں خالص انارکزم یا سوشلزم کی جگہ اس کے پہنچنے کے امکانات زیادہ ہیں۔

زیادہ مانوس لفظوں میں یوں بیانؔ کیا جا سکتا ہے کہ ہماری تجویز کا مدعا یہ ہے کہ ہر ایک کو تھوڑی سی آمدنی جو اس کی ضروریات کے لیے کافی ہو دی جائے خواہ وہ کام کرے یا نہ کرے اور زیادہ تنخواہ ــــــ جس قدر کل پیدا کی گئی اجناس گنجائش دے سکیں ان کو دی جائے۔ جو ان کاموں پر رضامند ہوں۔ جنہیں جماعت مفید خیال کرے اس بنیاد پر ہم عمارت کھڑی کر سکتے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ زیادہ اونچے کاموں کے لیے جنہیں زیادہ مجلسی فائدے کا سمجھا جائے۔ زیادہ تنخواہیں دی جائیں۔ کیونکہ ایسے کام دوسروں سے زیادہ دلچسپی اور باعزت ہوتے ہیں اور لوگ عموماً انہیں خود ہی دوسروں پر ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن ہم ان کو متوسط تنخواہ دے سکتے ہیں۔ جو مقررہ وقت سے نصف عرصہ کام کرنا پسند کریں اور ان کو دوسروں سے زیادہ جو ناگوار کام کرنا پسند کریں۔ ایسا طریقہ سوشلزم سے لگاؤ کھا سکتا ہے۔ اگرچہ بمشکل انارکزم کے ساتھ۔ اس کے فائدوں پر زیادہ تفصیل کے ساتھ کہیں آگے چل کر بحث کی جائے گی۔ ابھی میں اسی پر قناعت کرتا ہوں کہ اس میں آزادی اور انصاف سموئے ہوئے ہیں اور ان خطرات سے پاک ہے۔ جن کا انارکزم اور سوشلزم میں اندیشہ ہے۔

حوالہ جات

1- ہماری صدی کے بنیاپن نے لوگوں کے دماغوں کو جس خود غرضی سے بھر دیا ہے اس

سے بے نیاز کمیونسٹ رجحان مسلسل ابھرتا اور پبلک زندگی میں راہ پانے کی سعی کر رہا ہے۔ بھلا کرائے کے ٹٹو کی رضاکار کے آگے کیا بساط۔ اور یہی روح ہزاروں دیگر اداروں کی جان ہے۔ عجائب گھر، مفت لائبریریاں، مفت سکول، پارکیں اور طرب گاہیں، فرشائی اور روشنائی ہوئی گلیاں ہر ایک کے استعمال کے لیے کھلی ہیں۔ نجی گھروں میں پانی کا پہنچانا اور اب اس میں یہ رجحان بڑھتا جاتا ہے کہ جس قدر کوئی چاہے۔ استعمال کرے۔ ٹرام گاڑیاں اور ریلیں جنھوں نے موسمی ٹکٹ یا یکساں کرایہ جاری کرنا شروع کر دیا ہے اور نجی ملکیت نہ رہنے پر تو اس سے بھی بڑے پیمانے پر چلیں گی۔ یہ سب باتیں بتا رہی ہیں کہ آئندہ ترقی کس سمت کو ہو گی۔ (انارکسٹ فاسزم --- کروپا ٹکن)۔

2- انسانی طبیعت کام سے نہیں زیادہ کام سے گھبراتی ہے۔ جو تمام کی بہبود کے لیے نہیں۔ بلکہ چند کو سامان عیش بہم پہنچانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ کام اور محنت زندگی کی ایک ضرورت ہے۔ جمع شدہ جسمانی قوت کو خرچ کرنے کی ضرورت، صحت اور زندگی سے عبارت ہے اگر آج مفید کام کی اکثر شاخوں میں بیدلی سے کام کیا جاتا ہے تو محض زیادہ کام یا ان کی غیر مناسب تنظیم ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ چار گھنٹے روزانہ کام ہر ایک کو متوسط گھرانے کی آسائش مہیا کرنے کے لیے کافی ہے۔ اگر بیہودہ کام چھوڑ دیئے جائیں۔ اس بار بار دہرائے گئے بیہودہ سوال پر کہ "ناگوار کام کون کرے گا؟" میں فراخ دلی سے افسوس کرتا ہوں کہ ہمارے عالموں کو ایک دن کے لیے بھی ایسا کرنے کو نہیں کہا گیا۔ آج بعض کاموں کا ناگوار ہونا محض اس لیے ہے کہ ہمارے سائنس دان حضرات نے اسے کم ناگوار کرنے پر دھیان ہی نہیں دیا۔ انہیں خبر ہے کہ ہزاروں فاقے مرتے انسان اسے چند ٹکوں کے عوض کرنے کو تیار ہیں ---- (انارکسٹ کمیونزم)

3- "اس بار بار دہرائے گئے اعتراض کے متعلق کہ بغیر جبر کے کون کام کرنا پسند کرے گا۔ امریکہ میں غلاموں کی نجات اور روس میں مزارعین کی رہائی سے پہلے ہم بہت کچھ سنتے تھے۔ اب ہم کو اس کی پہچان کا موقع مل گیا ہے۔ جو لوگ مسلمہ واقعات پر ہی

قائل ہو سکتے ہیں۔ ان کا تو ذکر نہیں۔ البتہ عقل سے کام لینے والوں کو سمجھنا چاہیے کہ اگرچہ اپنے پست مدارج میں انسانوں کا یہی حال تھا یا آج بھی اگر ان بعض چھوٹی چھوٹی جماعتوں یا اشخاص کا یہی حال ہے۔ جو غیر موافق حالات کے باعث جہاد زندگی میں بری طرح ناکام ہو کر جی ہار بیٹھے ہیں۔ کم سے کم مہذب اقوام کی اکثریت تو ایسی نہیں۔ کام ہماری عادت بن چکا ہے اور بیکاری تکلف۔" (انارکسٹ کمیونزم)

پانچواں باب

قانون اور حکومت

چونکہ حکومت اور قانون کا ضمیر ہی آزادی کا گلا گھونٹنے سے ہے۔ اور آزادی سیاسی اچھائیوں میں سے سب سے بڑی اچھائی ہے۔ اس لیے ایک جلد باز تو بے سوچے سمجھے کہہ سکتا ہے کہ قانون اور حکومت وہ برائیاں ہیں جن کے سایہ میں آزادی کا پودا ہرا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اسے سچ یا جھوٹ ثابت کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس باب میں ہم ان دلیلوں کو دیکھیں گے۔ جو قانون اور حکومت کے خلاف ہیں۔ ہماری ساری گفتگو اس خیال کے مدنظر ہو گی کہ کسی اچھے مجلسی نظام کا پہلا مقصد آزادی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہم نے محسوس کیا ہو گا کہ انارکسٹی اعتراضات بھی بحث طلب ہیں۔

دوسروں کی آزادی کے احترام کا جذبہ اکثر لوگوں میں فطری نہیں ہوتا۔ حسد اور طاقت کی خواہش عام انسانوں میں دوسروں کی زندگیوں میں دخل دینے کی مسرت پیدا کر دیتے ہیں اور اگر تمام انسانوں کو ان کی حرکات کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس کا اثر یہ ہو گا کہ کوئی بھی آزاد نہیں ہو گا۔ زبردست کمزور کو دبائیں گے۔ اکثریت اقلیت کو ستائے گی۔ اور یہ بات مجھے درست معلوم نہیں ہوتی کہ برے جذبات سراسر ایک برے مجلسی نظام کی اولاد ہیں۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ مقابلہ پر مبنی سوسائٹی کی موجودہ تنظیم بہت حد تک انسان میں ان برے عناصر کو پالنے کی ذمہ دار ہے۔ طاقت کی خواہش ہرچند ایک جذبہ ہے۔ جو زیادہ حریص انسانوں میں پیدائشی ہوتا ہے۔ لیکن زیادہ

تر طاقت کا حقیقی استعمال ہی اسے ترقی دیتا ہے۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں کوئی بھی زیادہ طاقت نہیں پکڑ سکتا۔ دوسروں کو دکھ دینے کی آروز بہت کم ہو گی۔ پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بالکل نہیں رہے گی۔ اور جن میں زندہ رہے گی۔ ایسے لوگ ہوں گے جو غیر معمولی طاقت اور انتظامی قابلیت کے مالک ہوں گے۔ ایسے لوگ اگر انہیں برادری کی مرضی کے ماتحت نہ رکھا جائے۔ مطلق العنان بن جاتے ہیں یا ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔ جنہیں ایک طویل بدامنی کے بعد شکست دی جا سکتی ہے سیاسی اقتدار کے علاوہ افرادہ پر اقتدار کی خواہش ہوتی ہے۔ اس لیے اگر دھمکیوں اور دہشت زدگیوں کو قانوناً" نہ روکا جائے۔ تو اس میں ذرا شک نہیں ہو سکتا کہ مرد و زن، والدین اور اولاد میں ظلم و ستم کا راج ہو۔ اس سے انکار نہیں کہ ایک قوم کی عادتیں اور رسمیں اس ظلم کو شاذ کر سکتی ہیں۔ لیکن یہ عادتیں ایک لمبے قانونی دور کے بعد کہیں حاصل ہو سکتی ہیں۔ جنگی اقوام کان کھودنے والوں کے ڈیرے اور دوسری ایسی جگہوں کا تجربہ بتاتا ہے کہ نئے حالات میں لوگ آسانی کے ساتھ وحشیانہ اور رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔ اس لیے جب تک انسانی مزاج آج کا سا ہے۔ اس برادری کی نسبت جہاں ہر فرد اپنے جذبات کے لیے آزاد ہے۔ ایسی برادری میں زیادہ آزادی ہو گی۔ جہاں افراد کے بعض ظالمانہ اعمال کو ممنوع قرار دیا جائے گا۔ لیکن ہر چند ابھی کسی نہ کسی طرز حکومت اور قانون کی ضرورت ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قانون اور حکومت بذات خود ایک حد تک برائی ہے جسے اس وقت تک جائز کہا جا سکتا ہے۔ جب تک وہ دوسری زیادہ بڑی برائیوں کو روکتی ہے۔ اس لیے حکومت کے طاقت کے استعمال پر کڑی نظر رکھنی چاہیے۔ اور اُس کے اختیارات میں زوال کا استقبال ہی کرنا چاہیے۔ بشرطیکہ اس سے نجی ظلم کا دور نہ شروع ہو جائے۔

حکومت کے اختیارات کچھ قانونی ہیں اور کچھ معاشی---- ایسے فعل جنہیں سلطنت ناپسند کرتی ہے۔ تعزیرات کے ماتحت سزا کا باعث ہو سکتے ہیں۔ اور جو لوگ

حکومت کو ناراض کر لیں۔ ممکن ہے ان کے لیے روٹی کمانا مشکل ہو جائے حکومت کے بارے میں مارکس کے خیالات بہت صاف نہیں ہیں۔ ایک طرف وہ موجودہ حکومت پسند سوشلسٹوں کی طرح حکومت کو وسیع اختیارات دینا چاہتا ہے۔ لیکن دوسری طرف تجویز کرتا ہے کہ جب سوشلسٹ انقلاب ہو جائے گا۔ تو حکومت موجودہ حالت میں نہیں رہے گی۔ "اشتراکی اعلان" میں پیش کردہ فوری تدابیر میں سے بعض ایسی ہیں۔ جو حکومت کے احاطہ اور اقتدار کو بہت بڑھا دیتی ہیں۔ مثلاً ریاستی سرمایہ سے جاری کردہ قومی بنکوں کے ذریعے تمام حسابات کو ریاست کے حوالے کر دینا اور "رسل و رسائل کی مرکزیت اور اس پر ریاست کا قبضہ۔" لیکن اعلان یہ بھی کہتا ہے: "جب ترقی کرتے کرتے جماعتی تفاوت مٹ جائے گا۔ اور ساری پیداوار جمہور کی ایک بری انجمن کے ہاتھ میں آ جائے گی۔ تو لوگوں پر اقتدار کی سیاسی وقعت ختم ہو جائے گی سیاسی طاقت ایک جماعت کے دوسری جماعت کو دبانے کے لیے منظم قوت کے علاوہ کچھ نہیں۔ اگر بورژوا کے ساتھ مقابلہ کے دوران میں پرولتاری ایک جماعت بن گئے۔ اگر کسی انقلاب کے ذریعے اس کی حکومت ہو گئی اور اس نے پیداوار کے پرانے طریقے بدل ڈالے۔ تو اس کے ساتھ ہی جماعتی مخالفت اور جماعت سازیوں کے سب انداز بھی مٹ جائیں گے۔ اور بحیثیت ایک جماعت کے اس کا اپنا وجود بھی نہ رہے گا۔

بوڑھے بورژوا سماج کی نسبت جس کی گود میں جماعتی مخالفت اور فرقہ سازیاں ہیں۔ ہمارا سماج ایسا ہوگا۔ جس میں ایک کی آزاد نشوونما سب کی آزاد نشوونما ہو گی۔

ضروری مسائل میں مارکس نے عمر بھی یہی انداز قائم رکھا۔ چنانچہ یہ حیرت کی بات نہیں کہ اس کے پیرو جہاں تک اس کے فوری مقاصد کا تعلق ہے۔ سراپا حکومت پسند سوشلسٹ بن گئے ہیں۔ دوسری طرف سنڈیکلسٹ جنہوں نے مارکس سے صرف جماعتی لڑائی کا اصول لیا۔ اور جسے وہ اس کی تعلیم کی جان کہتے ہیں۔ حکومت کو

سخت نفرت سے دیکھتے اور اسے مٹا دینا چاہتے ہیں۔ اس بات میں وہ انارکسٹوں کے ہم خیال ہیں۔ گلڈ سوشلسٹ (اگرچہ یہاں بعض انہیں بھی انتہا پسند کہتے ہیں) انگریزوں کی مصالحت کیسی کا نمونہ ہیں۔ حکومت کو اختیارات دے دینے میں جو خطرات سنڈیکلسٹ ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے سبب وہ سٹیٹ سوشلزم سے غیر مطمئن ہیں۔ لیکن وہ انارکسٹوں کے اس خیال کو بھی قبول نہیں کر سکتے کہ بغیر کسی مرکزی طاقت کے سوسائٹی کامیاب ہو سکتی ہے۔ وہ تجویز کرتے ہیں کہ حکومت کے دو بازو ہونے چاہئیں۔ ایک وہ ہو جو خرچ کرنے والوں کی نمائندگی کرے اور جمہوری طور پر حکومت کو چلائے۔ دوسرا پیدا کرنے والون کی نمائندگی کرے۔ لیکن اس کی تنظیم صنعتی اتحاد کی طرح منڈیوں میں ہو۔ ان کے ہاتھ کل انتظام ہو۔ گلڈ سوشلسٹ صنعتی سروری کو حکومت کا جزو نہیں سمجھتے۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ حکومت کا جغرافیائی ہونا ضروری ہے لیکن صنعتی سروری موجودہ حکومت سے اس لحاظ سے مشابہ ہو گی کہ اس کے پاس امتناعی اختیارات ہوں گے اور اس کے احکام ضرورت کے وقت عائد کیے جائیں گے یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ سنڈیکلسٹ بھی موجودہ حکومت کو کوسنے کے باوجود ٹریڈیونین کے ذریعے افراد پر دباؤ ڈالنے پر جز بز نہیں ہوں گے۔ ٹریڈیونین کے اندر حکومت اسی قدر سنگین ہو گی۔ جس قدر آج ہے۔ یہ کہتے ہوئے ہم فرض کر رہے ہیں کہ سنڈیکلسٹ لیڈروں کی نظری انارکزم اختیارات مل جانے کے بعد نہ رہ سکے گی اور تجربہ بتاتا ہے کہ یہ کوئی خطرناک قیاس نہیں ہے۔

ان سب باتوں میں انارکسٹوں کا یہ خیال زیادہ بحث طلب ہے کہ جماعت کی طرف سے ہر تشدد غیر ضروری ہے۔ ان کی اکثر باتوں کی طرح اس کی حمایت میں بھی اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت ہے۔ جس قدر لوگ پہلی نگاہ میں خیال کریں گے کروپا ٹکن جو اس کا قابل ترین علمبردار ہے بتاتا ہے کہ آزاد مصالحت نے کیا کچھ کر دکھایا ہے وہ حکومت کو مجموعی فیصلوں کے رنگ میں نہیں مٹانا چاہتا ہے جس کے ذریعے فیصلے ان پر

ٹھونسے جاتے ہیں۔ جو ان کے خلاف ہوتے ہیں۔ (1) نمائندہ حکومت اور اکثریت کی بادشاہی اس کے نزدیک بری چیزیں (2) ہیں۔ وہ یورپ کے مختلف ریلوے سسٹموں کے درمیان ایکسپریس ٹرین چلنے اور عام تعاون کے متعلق سمجھوتوں کی مثال دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایسی حالت میں مختلف کمپنیاں نمائندے مقرر کر دیتی ہیں جو سمجھوتے کی شرائط طے کر لیتی ہیں۔ جن پر ان کی جماعتیں صاد کر دیتی ہیں۔ نمائندوں کی جماعت کے پاس امتناعی اختیارات نہیں ہوتے۔ اور اکثریت بھڑکی ہوئی اقلیت کے سامنے عاجز ہوتی ہے۔ تاہم بڑے بڑے نظاموں میں سمجھوتے ہونے سے نہیں رہے انارکسٹ کہتے ہیں کہ ان طریقوں سے تشدد کے بغیر بھی حکومت کے مفید کام سرانجام پا سکتے ہیں۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر موجودہ ذاتی ملکیت کے نظام کی تباہ کاریاں نہ رہیں۔ تو معاہدہ کا مفید ہونا ہی اس کے چل جانے کی کافی ضمانت ہے۔

یہ خیال اگرچہ بہت سہانا ہے۔ لیکن میں کہنے سے نہیں رہ سکتا کہ اس کا باعث بے صبری اور منزل کی طرف چھوٹی راہ ڈھونڈھنے کی وہ کوشش ہے جو انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔

پہلے ہم نجی جرم کو لیتے ہیں۔ انارکسٹ کہتے ہیں کہ خراب مجلسی فضا لوگوں کو مجرم بنا دیتی ہے۔ اور ہماری پیدا کردہ دنیا میں یہ باتیں نہ رہیں گی۔ (3) اس میں شک نہیں کہ یہ بہت حد تک ٹھیک بھی ہے۔ مثال کے طور پر انارکسٹی دنیا میں لوٹ مار کی خواہش نہیں ہو گی۔ جب تک اسے بڑے پیمانے پر لوگوں کا ایک گروہ انارکسٹ نظام کو گرا دینے کے لیے اختیار نہ کرے۔ اور اس کے ساتھ ہی اچھی تعلیم بھی بہت حد تک مجرمانہ تشدد کے جذبات کو مٹا دیتی ہے۔ لیکن ان سب کی ایک حد ہے۔ زیادہ انتہائی مثال لیتے ہوئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ انارکسٹ برادری میں پاگل نہیں ہوں گے۔ اور ان میں سے بعض انسانوں کو مار دینے والے نہیں ہوں گے۔ ان لوگوں کو آزاد چھوڑ دینے کی غالباً" کوئی حمایت نہ کرے گا۔ لیکن فطرت گری حدود نہیں رکھتی انسان کش

دیوانے سے تشدد آمیز جذبات کے سمجھدار انسان تک مسلسل زینے ہیں۔ بہت مکمل برادری میں بھی ایسی عورتیں اور مرد ہوں گے کہ دیدہ دانستہ حسد میں آ کر قتل پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ آج سزا کا ڈر انہیں روک دیتا ہے۔ لیکن اگر یہ خوف نہ رہے تو شاید ایسے قاتلوں کی تعداد اور زیادہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ بعض قسم کا رویہ لوگوں میں دشمنی ابھارتا ہے۔ پھر بعض لوگوں میں قدرتی طور پر انتقامی جذبہ پایا جاتا ہے۔ جو ہمیشہ برادری کے برے لوگوں کو ہی نشانہ نہیں بناتا۔ مثلاً سپنوزا کو محض اس لیے قتل کر دیا گیا کہ اس پر ایسے وقت میں جب ہالینڈ اس کے خلاف لڑ رہا تھا۔ فرانس پرستی کا شبہ ہوا۔ ان باتوں کے علاوہ انارکزم کو تباہ کرنے اور قدیم جبر کو رواج دینے کی منظم سازش کا خطرہ بھی ہو سکتا ہے۔ کیا یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ کروپا ٹکن کی تصور کردہ برادری میں نپولین پیدا ہوتا تو وہ ایسی دنیا میں بے چون و چرا دن کاٹتا جس میں اس کی ذہانت کے لیے میدان نہ ہوتا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ حریص آدمیوں کی پرائیویٹ فوج بن جائے۔ سامان جنگ تیار کرنے اور آخر نہتے شہریوں کو جو آزادی کی سہانی جھلک پر بھولے رہے ہوں۔ غلام بنانے سے کون طاقت روکے گی۔ یہ انارکزم کے اصولوں کے خلاف ہو گا کہ پرائیویٹ فوج کے عمل میں مداخلت کرے۔ خواہ اس کا مدعا کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اگر لیٹروں کی فوج ملک کے اندر سے نہ بھی اٹھے۔ تو بھی ہمسایہ قوم آسانی کے ساتھ آ سکتی ہے۔ یا وہ نسلیں جو تہذیب کی سرحدوں پر ہیں۔ جب تک اقتدار کی خواہش زندہ ہے۔ برادری کی منظم قوت کے بغیر کوئی اور چارہ نہیں جس سے اس کو تشدد کا رنگ لینے سے روکا جا سکے۔

اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ برادری کا انارکسٹی نظریہ جس میں قانون کسی حرکت کو نہیں روکتا۔ اس دنیا کی مضبوطی قائم نہیں رکھ سکتا۔ جس کی انارکسٹوں کو تلاش ہے اس سے ملتی جلتی دنیا پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بعض اعمال پر قانونی پابندی ہو۔ اور ان کو ہم تین عنوان دے سکتے ہیں۔ 1- چوری 2- تشدد 3- انارکزم

کا تختہ الٹنے کے لیے جماعتیں پیدا کرنا۔ ان کے متعلق جو کچھ ابھی کہا گیا ہے۔ اسے مختصر طور پر ہم پھر دہرا دیتے ہیں۔

چوری

اس سے انکار نہیں کہ انارکسٹ دنیا میں فاقہ نہیں ہوگا۔ اس لیے لوگ بھوک سے تنگ آ کر چوریاں نہیں کریں گے۔ لیکن اس وقت ایسی چوریاں بحث طلب ہیں۔ تفریحات کا حصہ رسدی طریقہ بعض کو اس سے کم دے گا۔ جتنی ان کی خواہش ہو گی اور جمہوری خرمنوں کے نگہبانوں کو من مانیاں کرنے کے مواقع ملیں گے۔ کہا جا سکتا ہے کہ چوری کی یہ قسمیں رائے عامہ کے ذریعے روکی جا سکتی ہیں لیکن رائے عامہ کے فرد پر ذرہ بھر اثر نہیں ہوتا۔ جب تک وہ اس کے گروہ کی آواز نہ ہو گا۔ انسانوں کا ایک گروہ چوری کے ارادے سے اکثریت کی آواز کو جب تک اسے طاقت کے ذریعے کارگر نہ بنایا جائے ٹھوکر سے اڑا سکتا ہے۔ پھر غالباً" اس طاقت کا استعمال بھی نفرت عامہ کے ذریعے کیا جائے گا اور اس صورت میں وہی تعزیراتی برائیاں زندہ ہو جائیں گی۔ بلکہ ان کے ساتھ بے یقینی جلد بازی اور غصہ مزید ہو گا۔ جو انتقام کی اس نوعیت سے جدا نہیں رہ سکتے۔ بلکہ جیسا کہ ہم نے تجویز کیا ہے۔ بے کاروں کو کم تفریحات دے کر کام کے لیے مالی محرک مہیا کیا جائے۔ تو بھی انہیں چوری کے لیے نیا بہانہ ملے گا۔ اور تعزیراتی قانون بنانے کی ضرورت ایک نیا رنگ لے گی۔

تشدد والے جرائم

بچوں پر ظلم، حسد کے جرم، لوٹ مار اور اس طرح کی باتیں کسی حد تک ہر سوسائٹی میں رہنی یقینی ہیں۔ اور کمزوروں کے آزادی سے سانس لینے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے جرائم کی روک تھام کی جائے۔ ورنہ سوسائٹی کی رسمیں بھدی اور افراتفری عام ہو جائے گی۔ اور اگر انارکسٹوں کا یہ کہنا درست نکلا کہ ان کے کہے گئے

اقتصادی نظام میں ایسے جرائم نہ رہیں گے۔ تو ان کے منع کرنے کا قانون بے اثر رہے گا اور آزادی کو خطرہ نہیں رہے گا۔ لیکن اگر ایسی حرکتوں کے لیے جذبہ کارفرما رہا۔ تو ضروری ہو جائے گا کہ لوگوں کو اس سے بچانے کے لیے کوئی قدم اٹھایا جائے۔

انارکزم کا تختہ الٹنے کے لیے جماعتیں پیدا کرنا

تیسری قسم کی تکلیفیں زیادہ اہم ہیں اور آزادی پر بری طرح چھاپہ مارتی ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ انارکسٹ برادری میں پرائیویٹ فوج کیونکر گوارا کی جا سکتی ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اسے کس طرح روکا جا سکتا ہے۔ جب تک ہتھیار رکھنے کو بالکل بند نہ کر دیا جائے۔ ورنہ حریف فوجیں طاقت بنائیں گی اور خانہ جنگی چھڑ جائے گی۔ لیکن اگر ممانعت کی جائے تو اسے اچھی طرح عمل میں نہیں لایا جا سکتا۔ جب تک شخصی آزادی میں مداخلت نہ کی جائے۔ ممکن ہے وقت گزرنے پر سیاسی مقصد کے لیے تشدد کے استعمال کا خیال بھی جاتا رہے۔ لیکن خیال اور عمل میں یہ تبدیلیاں قانونی امتناع ہی آسان کرتی ہے اور اس کے بغیر ان کا ہونا بہت دشوار ہے۔ میں ابھی اس مسئلہ کے بین الاقوامی پہلو کو نہیں چھیڑتا۔ کیونکہ اس پر دوسرے باب میں بحث کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ بات صاف ہے۔ کہ یہی باتیں زیادہ قوت کے ساتھ قوموں کے باہمی تعلقات پر بھی وارد ہوتی ہیں۔

اگر تسلیم کر لیا جائے کہ تعزیرات ناگزیر ہے اور بعض حرکتوں کو روکنے کے لیے قوت کا ہونا لازمی ہے۔ تو ایک سوال اور نکل آتا ہے---- قوت کے خلاف ہمارا رویہ کیسا ہونا چاہیے؟ آزادی کے احترام اور انسانیت کا کون سا بڑا سوال ہے۔ جو اقبال جرم کے ساتھ موافقت کرتا ہے؟ اس سلسلے میں پہلا کام یہ ہے کہ جرم یا گناہ کا سارا تصور ہی ملیامیٹ کر دیا جائے۔ آج مجرم کو نفرت سے دیکھا جاتا ہے۔ جرم کو روکنے کے لیے صرف مجرم کو سزا دینا ہی کافی سمجھا گیا ہے۔ اس کی روح کو توڑنے اور احترام نفس کو

برباد کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا جاتا۔ وہ مسرتیں جن کا اس پر خوشگوار اثر پڑ سکتا ہے۔ اس سے محض اس لیے دور رکھی جاتی ہیں کہ وہ مسرتیں ہیں۔ پھر جو تکلیفیں اسے پہنچائی جاتی ہیں۔ ایسی ہوتی ہیں جو اسے درشت بنا دیتی اور زیاد تباہ کر دیتی ہیں۔ یہاں میں ان چند اداروں کا ذکر نہیں کر رہا۔ جنہوں نے مجرموں کے سدھار کو دل و جان سے ہاتھ میں لیا ہے۔ ان اداروں سے خصوصاً امریکہ میں اچھے اچھے نتائج حاصل ہوئے۔ لیکن وہ جگہ گنتی کی ہیں اور قانون کا عام انداز ہی ایسا ہے۔ کہ مجرم سماج سے نفرت کرنے لگتا ہے وہ اس فضا سے نڈر اور دشمن بن کریا سر جھکاتا سجدے کرتا ٹوٹی ہوئی روح اور کھوئی ہوئی عزت کے ساتھ نکلتا ہے یہ دونوں حالتیں بذات خود برائی ہیں اور اس چارہ کار سے اچھائی کی امید نہیں ہوسکتی جس میں لعنت کوٹ کر بھری ہو۔

جب کوئی شخص متعدی مرض کا شکار ہو جاتا ہے تو وہ دوسروں کے لیے بھی خطرہ ہوتا ہے اور اس کی آزاد نقل و حرکت پر پابندی بہت ضروری سمجھی جاتی ہے لیکن کوئی بھی مجرم کو اس رنگ میں نہیں دیکھتا۔ جرم کے علاج میں بھی یہی طریقے کام میں لانے چاہئیں۔ مگر یہاں تو فرض کر لیا گیا ہے۔ کہ مجرم ذاتی مفاد کا اکسایا ہوتا ہے اور سزا کا خوف ہی اس کا علاج ہے۔ "کتا باؤلہ تھا اور اس نے آدمی کو کاٹ کھایا۔" جرم کے متعلق یہ نظریہ بہت عام ہے۔ لیکن کوئی کتا مرضی سے باؤلہ نہیں ہوتا اور یہی حال اکثر مجرموں کا ہے۔ خصوصاً ان جرموں کی حالت میں جو جوش میں سرزد ہوتے ہیں۔ ذاتی مفاد کی اکسائی ہوئی حالتوں میں بھی ضرورت مجرم کو دکھ دینے کی نہیں۔ بلکہ جرم کو روکنے کی ہے۔ اس سلسلے میں اگر کوئی تکلیف ناگزیر ہو تو اسے جراحی عمل کا درد سمجھ کر قبول کر لینا چاہیے۔ جو شخص تشدد کے جذبہ کے ماتحت جرم کرتا ہے اس کا نفسیاتی علاج ہونا چاہیے۔ جس کے ذریعے زیادہ مفید جذبات ابھر سکتے ہیں۔ جو شخص ذاتی مفاد کے ماتحت جرم کرتا ہے۔ اسے محسوس کرا دینا چاہیے کہ ذاتی مفاد اس زندگی میں زیادہ پورا ہوتا ہے۔ جو دوسروں کے لیے مفید ہو۔ بہ نسبت اس کے جو نقصان دہ ہو۔ اس

مقصد کے لیے ضروری ہے کہ اس کا خیال بلند اور امیدوں کی فضا وسیع کی جائے۔ آج جب ایک شخص میں دوسروں کے لیے محبت کم پائی جاتی ہے تو اس کا مداوا ایسے طریقے سے کیا جاتا ہے۔ جس کا کامیاب ہونا ناممکن ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں بھی وہی کم مروتی پائی جاتی ہے۔ قید خانوں کا مقصد آج انفرادی حالت کا مطالعہ نہیں بلکہ محض گڑبڑ روکنا ہے۔ مجرم ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا جاتا ہے۔ جہاں وہ زمین پر ہوتے ہوئے بھی زمین سے دور ہوتا ہے وہ ان پاسبانوں کی سختیاں جھیلتا ہے جنہیں ان کے پیشہ نے درندہ بنا دیا ہوتا ہے۔ اسے بڑے تقدس کے ساتھ سماج کا دشمن کہہ دیا جاتا ہے۔ اس کو ایسے کٹھن کاموں کے لیے مجبور کیا جاتا ہے۔ جن کا مقصد اسے اکتا دینا ہوتا ہے۔ ذاتی اصلاح کے لیے اسے کوئی تعلیم یا ترغیب نہیں دی جاتی۔ پھر حیرت کیوں ہو اگر ایسے سلوک کے ختم ہونے پر لوگوں کے متعلق اس کے خیالات اسی قدر باغیانہ ہوں۔ جس قدر ابتدا میں تھے۔

سزا میں سختی انتقام اور خوف میں سے اس وقت پیدا ہوئی جب اکثر مجرم عدالت سے بالکل بچ جاتے۔ اس وقت خیال کیا گیا تھا کہ وحشیانہ سزائیں مجرم کے دماغ پر ایسی چھا جائیں گی۔ اسے فرار کی راہ نظر نہ آئے گی۔ آج تعزیرات کا بہت بڑا حصہ ملکیت کے حقوق کی حفاظت یا یوں کہئے کہ امیروں کے ناجائز حقوق کے متعلق ہے ایسی تنقید کا بہت گہرا اثر ہو سکتا تھا۔ اگر پارلیمانی جمہوریت کے مقابل کسی اور طرز کا پرچار بہت عام کر دیا جاتا۔ لیکن سنڈیکلسٹوں نے تو اپنی نمائندگی کچھ اس انداز سے کی ہے کہ عام شہری مائل نہیں ہو سکتے۔ ان کی باتوں کا خلاصہ یوں ہے کہ کامیاب صنعت میں کام کرنے والے ماہر مزدوروں کی اقلیت ساری برادری کی مالی زندگی کو دشوار کر سکتی ہے۔ اور اس طرح قوم پر اپنی مرضی ٹھونس سکتی ہے۔ وہ اپنے عمل کو بارود خانہ پر قبضہ کرنے کے مترادف سمجھتے ہیں۔ جس کے ذریعے سارا نظام تہہ و بالا کیا جا سکتا ہے۔ ایسا نظریہ طاقت کے استعمال کی دعوت دیتا ہے اور اس کا جواب بھی قدرتی طور پر پتھر

سے دیا جاتا ہے۔ سنڈیکلسٹوں کی یہ چیخ پکار کہ وہ آزادی کو ترقی دینے کے لیے طاقت حاصل کرنا چاہتے ہیں، عبث ہے۔ جس دنیا کے وہ خواب دیکھ رہے ہیں ابھی جنتا (عوام) ان کے لیے پوری آمادہ نہیں ہے اور اس کی تعبیر اس وقت تک ناممکن ہے۔ جب تک عوام بیدار نہ ہو جائیں۔ ترغیب بڑی سست رفتار ہوتی ہے۔ اور گاہے بگاہے اسے پرتشدد طریقوں سے تیز کر دیا جائے تو کوئی ہرج نہیں لیکن ہر مصلح جو آزادی کا دعویٰ کرتا ہے۔ اپنے مقصد میں ترغیب کے ذریعے ہی کامیاب ہو سکتا ہے۔ آزادی کو ان پر ٹھونسنے کی کوشش جو آزادی نہیں چاہتے ہمیشہ ناکام رہتی ہے اور سنڈیکلسٹوں کو بھی دوسرے اصلاح کرنے والوں کی طرح ترغیب ہی سے کام لینا چاہیے۔ لیکن مقاصد کو ذرائع سے خلط ملط کر دینا غلطی ہو گی۔۔۔۔ بھوک کے ذریعے نا رضامند قوم پر جنت ٹھونسنے کی تجویز سے ہمیں اتفاق نہ ہو تو بھی اس سے انکار ممکن نہیں کہ سنڈیکلسٹوں کی آرزو کا بہت بڑا حصہ پسندیدہ ہے۔

پارلیمانی حکومت پر ان تنقیدوں کو دماغ سے نکال کر جو ذاتی ملکیت کے موجودہ نظام سے وابستہ ہیں۔ ہم ان پر بحث کرتے ہیں۔ جو اجتماعی برادری پر بھی راست آتی ہیں۔ نمائندہ اداروں میں بعض طبی نقائص ہیں: خود اہمیتی کے جذبہ کو اس کامیابی سے جدا نہیں کیا جا سکتا جو ہر دلعزیزی کے سبب حاصل ہوئی ہو اس کے علاوہ مکاری ناگزیر ہے۔ کیونکہ تجربہ بتاتا ہے کہ جمہوریت کسی خطیب کے مخلص نہ ہونے کا پول نہیں کھولتی۔ بلکہ ممکن ہے اسے ان باتوں سے صدمہ پہنچے۔ جنہیں مخلص ترین انسان ضروری سمجھتے ہوں۔ یہاں سے انتخاب شدہ نمائندوں میں بیگانگی اور اس کے ساتھ ہی یہ خیال کہ سیاست میں چالبازی کے بغیر کوئی بھی اقتدار حاصل نہیں کر سکتا جاگ اٹھتے ہیں۔ یہ جمہوریت اور نمائندوں کا یکساں قصور ہے اور اس وقت تک اٹل ہے۔ جب تک لوگوں کی جماعتیں اپنے مجاہدوں سے خوشامد کی بھینٹ لیتی رہیں گی۔ ایک اور برائی جو بڑی بڑی حکومتوں میں دیکھی جاتی ہے۔ حکومت کی نشست کی اکثر حلقوں سے دوری

ہے اور یہ دوری جغرافیائی سے کہیں زیادہ نفسیاتی ہوتی ہے قانون ساز مضبوط دیواروں اور بے شمار سپاہیوں کے اندر لوگوں کی آواز و فریاد سے محفوظ عیش میں دن بسر کرتے ہیں۔ اور خوب خوب وقت گزرتا جاتا ہے انہیں اپنی انتخابی لڑائی کے جذبات اور وعدوں کا دھندلا سا تصور رہ جاتا ہے۔ وہ اپسے سیاسی مدبر کی جان سمجھنے لگتے ہیں کہ بعض نامطمئن طبقوں کی نسبت مجموعی طور پر ساری قوم کی فلاح کا کام کیا جائے۔ لیکن قوم کے مفاد اس قدر دھندلے ہیں کہ ذاتی مفاد کے ساتھ متفق نہیں ہو سکتے۔ ان باتوں سے شعوری یا غیر شعوری طور پر پارلیمنٹ لوگوں کو دغا دے جاتی ہے۔ پھر کوئی تعجب نہیں اگر مزدور تحریک کے سرگرم مجاہد جمہوری نظریہ سے بیگانے ہوتے جا رہے ہیں۔

اکثریت کے اقتدار کا جو دستور بڑی بڑی حکومتوں میں ہے۔ اس میں بڑا مہلک نقص یہ ہے کہ اکثر معاملات میں قوم کے تھوڑے سے حصہ کو بلاواسطہ لگاؤ یا علم ہوتا ہے۔ اور جب لوگوں کو کسی سوال سے دلچسپی نہ ہو۔ تو انکا ضعیف روائتوں کے اثر میں آ جانا ممکن ہوتا ہے۔ اس کا ثبوت ماتحت قوموں کو آزادی دینے میں غیر معمولی ہچکچاہٹ سے ملتا ہے۔ اسی سبب سے ساری قوم کو ایک چھوٹے سے طبقہ کے معاملات کا فیصلہ کرنے کا اختیار دے دینا خطرناک ہے۔ خواہ وہ طبقہ جغرافیائی ہو یا صنعتی یا کسی اور طرح کا۔ اس کا بہترین علاج یہی ہے کہ قوم کے ہر جاندار گروہ کو اس کے اندرونی معاملات میں آزادی دے دی جائے۔ گروہ کی حکومت ایک تو گروہ کی چنی ہوئی ہو گی۔ دوسرے دور افتادہ پارلیمنٹ سے زیادہ اپنے نمائندوں سے وابستہ اور ان کے برے بھلے کو جاننے والی ہو گی۔ سنڈیکلزم میں زیادہ اچھوتا خیال جسے گلڈ سوشلسٹوں نے اپنا کر ترقی دی ہے۔ کہ صنعتوں کو جہاں تک ان کے اندرونی معاملات کا تعلق ہے خود مختار اجزا بنا دیا جائے۔ اس طرح ان دوسرے طبقوں میں بھی اسے رائج کرتے ہوئے جن کے مفاد جدا جدا ہیں۔ نمائندہ جمہوریت کی برائیاں بہت حد تک دور ہو جائیں گی۔

گلڈ سوشلسٹ ایک اور تجویز بھی بتاتے ہیں جو صنعتی سبھاؤں کی خود مختاری سے خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے حکومت کی طاقت بھی کم ہو جاتی ہے اور شخصی آزادی بھی برقرار رہتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پارلیمنٹ کے علاوہ جو ملکی بنیاد پر چنی گئی ہو گی اور کھپت کی حیثیت سے قوم کی نمائندہ ہو گی۔ گلڈ کانگرس بھی ہونی چاہیے جو موجودہ ٹریڈیونین کانگرس کی لائق جانشین ہو اور ان نمائندوں سے مرکب ہو۔ جنہیں گلڈوں نے انتخاب کیا ہو اور جو قوم کی پیداواری حیثیت کی نمائندگی کرے۔

حکومت کی زیادہ طاقت کو کم کرنے کا یہ طریقہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ جی ڈی۔ ایچ کول نے "صنعت میں خود اختیاری" میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جہاں اب حکومت فیکٹری ایکٹ کان ایکٹ یا ریگولیٹنگ ایکٹ پاس کرتی ہے مستقبل میں گلڈ کانگرس ایسے ایکٹ پاس کیا کرے گی۔ اور انہیں چلانے کے لیے اس کے بھی حکومت ایسے اختیار ہوں گے۔" (ص 98) اس نظام کا وہ اس لیے پرچار کرتا ہے کہ اس کے خیالات میں اس سے شخصی آزادی بحال رہے گی۔ "جمہوری سماج میں مجلسی تنظیم کی صنعتی اور سیاسی شکلوں کو برقرار رکھنے کا بنیادی سبب یہ ہے کہ صنعتی سرمایہ کے وسیع اقتدار کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے ہی سے فرد کے آزاد رہنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔" (ص 91)

کیا مسٹر کول کے بتائے ہوئے نظام کا یہی نتیجہ ہو گا؟ میرا خیال ہے کہ موجودہ نظام سے کہیں بہتر ہو گا۔ نمائندہ حکومت کی اصلاح اسی طرح ہو سکتی ہے کہ نمائندوں کو دستور حکومت سازی سے متعلق مفاد کے قریب کر دیا جائے اور یہ غالباً" گلڈ کانگرس کے ذمے پیداوار کے مسائل کر دینے ہی سے ہو سکتا ہے لیکن اگر ان بتائی ہوئی احتیاطوں کے باوجود گلڈ کانگرس ایسے معاملات میں قادر مطلق بن جاتی ہے۔ اگر اس کی مرضی کا مقابلہ ایک گلڈ کے ذریعے جسے زیادتی کا شکوہ ہو بے سود ثابت ہو۔ مجھے ڈر ہے کہ وہی برائیاں لوٹ آئیں گی جو آج حکومت کی ہمہ گیری سے لپٹی ہوئی ہیں۔

ٹریڈیونین افسر ملک میں حکمران طاقت کا حصہ بنتے ہی قدامت پسند اور خود سر ہو جاتے ہیں۔ ان کی نمائندوں کے ساتھ وابستگی نہیں رہتی اور نفسیاتی ہمدردی کے سبب وقت کے حاکموں سے تعاون کر جاتے ہیں۔ گلڈ کانگرس کے ذریعے ان کا اختیار چڑھنا اس رفتار کو اور تیز کر دے گا۔ کھلے بندوں نہ سہی پھر بھی وہ پارلیمنٹ پر اختیار رکھنے والوں کے ساتھ ملنے لگیں گے۔ وقتی جھگڑوں کو چھوڑ کر جو حریف ساہوکاروں کی اس رقابت کی مانند ہیں جو آج بھی بعض اوقات سرمایہ داری دنیا کا سکون لوٹ لیتی ہے بسا اوقات ان کے کرتے دھرتوں میں موافقت ہی رہا کرے گی۔ اور اس ہم آہنگی سے وہ شخصی آزادی چھپ کر رہ جایا کرے گی۔ جس کی آقاؤں کی لڑائیوں ہی سے حاصل ہونے کی توقع ہوتی ہے۔

اگر ہم غلطی پر نہیں ہیں تو ایسا کوئی طریقہ نہیں۔ جس سے ساری جماعت کی نمائندگی کرنے والی انجمن آزادی کی محافظ ہو سکتی ہے۔ آزادی کو برقرار رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ شہریوں کو مختلف ہم مفاد گروہوں میں ترتیب دے دیا جائے جو اندرونی معاملات کے فیصلہ کرنے میں آزاد ہوں۔ اور کسی مداخلت کا ہڑتال کے ذریعے مقابلہ کر سکیں۔ خواہ وہ حکومت کی طرف سے ہو۔ اس طرح نہ صرف مناسب تنظیمیں ہو جائیں گی۔ بلکہ آزادی کا عام احترام پیدا ہو جائے گا۔ اور حکومت کے سامنے عملی اور فکری بے چارگی نہ رہے گی۔ اس سوسائٹی میں بدامنی کا کچھ نہ کچھ خطرہ ضروری ہے۔ لیکن وہ اس بندش کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ جو ایک ہمہ اوست مرکزی حکومت سے پیدا ہو جاتی ہے۔

حکومت کے اختیارات کی بحث کا اب ہم خلاصہ پیش کرتے ہیں : انارکسٹوں کے کہنے کے باوجود حکومت بعض باتوں میں ضروری معلوم ہوتی ہے صلح اور جنگ محصول۔ حفظان صحت اور مضر ادویات کی فروخت کے قواعد۔ تقسیم کے عادلانہ نظام کی برقراری اور ایسی کئی باتیں حکومت کے بغیر ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر چین میں افیون کے

محصول کو لو یا الکحل اگر بغیر ٹیکس لگانے کے قیمت خرچ پر حاصل ہو جائے۔ اس سے بھی بڑھ کر اگر مفت ملے۔ جیسا کہ انارکسٹ چاہتے ہیں۔ تو کیا پینے کی وبا عام نہ ہو جائے گی۔ چین کو افیم نے تباہی کے کنارے پر لا کھڑا کیا تھا اور ہر محب وطن چینی نے اس کی تجارت محدود کرنے کی آرزو کی ان معاملات میں آزادی تریاق میں زہر ہے اور قومی صحت کے لیے کچھ نہ کچھ قانونی پابندی ضروری ہے۔

لیکن یہ مان لینے کے بعد کہ حکومت کسی نہ کسی صورت میں رہنی چاہیے ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ اس کے اختیارات بہت محدود ہونے چاہئیں اور ان کو محدود کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ گروہ بنا دیئے جائیں۔ جنہیں اپنی آزادی اور حقوق کا خیال ہو اور اس کے لیے وہ حکومت کے قوانین سے الجھنے کو بھی تیار ہوں۔ اگر وہ قانون ان کے اندرونی معاملات میں بے جا مداخلت کریں حکومت کی ستائش اور یہ خیال کہ حکومت کی خدمت ہر شہری کا فرض ہے۔ بنیادی طور پر ترقی اور آزادی کے خلاف ہے۔ آج حکومت بہت سی برائیوں کی جڑ ہے۔ لیکن اس کے فائدے بھی ہیں۔ اور جب تک پرتشدد اور تخریبی جذبات عام ہیں اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ لیکن یہ محض وسیلہ ہے اور اسے بڑی احتیاط سے کام میں لانا چاہیے کہ کہیں نقصان نہ دے۔ ہمیں حکومت کی نہیں۔ بلکہ امروز و فردا کی ساری انسانی برادری کی خدمت کرنی چاہیے اور یہ برادری حکومت کی ستائش سے نہیں بلکہ افراد کی آزاد بالیدگی سے---- روزمرہ زندگی میں مسرت سے مزاج کے موافق کام سے' جس میں ہر ایک کے تعمیری جذبات کو موقعہ مل سکے۔ آزاد ذاتی تعلقات سے جن سے محبت چھلکتی ہو اور ظلم و حسد کا نام نہ ہو۔ اور سب سے بڑھ کر زندگی کی مسرت اور آرٹ اور سائنس کی بے ساختہ تخلیق میں اس کے اظہار سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ باتیں ہی کسی دور یا قوم کو قابل زیست بناتی ہیں اور انہیں حکومت کے در پر سجدہ کرنے سے حاصل نہیں کیا جا سکتا اشخاص میں ملکوتی صفات کی تکمیل ہونی چاہیے۔ اور دنیا کی تجدید کرنے والے کسی

سیاسی نظام کا واحد مقصد آزاد شخصی نشوونما ہونا چاہیے۔

حوالہ جات

1- ”حکومت کو اکثر خلط ملط کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ حکومت کے بغیر کوئی سلطنت نہیں ہو سکتی۔ اس لیے بعض دفعہ کہا جاتا ہے کہ سلطنت کی معدومی پر نہیں فقدان پر زور دینا چاہیے..... میرے خیال میں سلطنت اور حکومت دو مختلف خیال ہیں۔ سلطنت میں نہ صرف سوسائٹی کے اوپر ایک طاقت کا وجود ہونا بلکہ ایک ارضی مرکزیت اور سوسائٹی کی زندگی کے بہت سے کاموں کا چند یا تمام کے ہاتھوں میں ہونا بھی شامل ہے۔ یہ سوسائٹی کے افراد میں نئے تعلقات بناتی ہے..... یہ امتیازی فرق جو پہلی نگاہ میں دکھائی نہیں دیتا۔ سلطنت کی پیدائش کا مطالعہ کرنے سے سامنے آ جاتا ہے۔“
(کروپا ٹکن) ”The State“

2- نمائندہ حکومت نے اپنا تاریخی فرض ادا کر دیا ہے۔ اس نے درباری حکومت کو مہلک ضرب لگائی اور بحثوں کے ذریعے عوام میں بیداری پیدا کر دی لیکن فردا کی سوشلسٹ سماج کی حکومت کا خواب اسی میں دیکھنا غلطی ہے زندگی کے ہر معاشی پہلو کا اپنا سیاسی پہلو ہوتا ہے اور موجودہ معاشی زندگی کی جڑ۔ نجی ملکیت کو چھیڑنا ناممکن ہے۔ جب تک سیاسی تنظیم میں زبردست تبدیلی نہ آ جائے۔ زندگی پکار دیتی ہے کہ تبدیلی فلاں سمیت میں ہو گی۔ اور وہ حکومت کی طاقت کو زیادہ کرنے میں نہیں۔ بلکہ آزاد تنظیم اور ان تمام شاخوں کی آزاد فیڈریشن میں ہے۔ جنہیں آج حکومت کے دست و بازو کہا جا سکتا ہے۔ (انارکسٹ کمیونزم)

3- تیسرا اور سب سے بڑا اعتراض جو قانون توڑنے والوں کو سزا دینے کے لیے حکومت کا جواز پیش کرتا ہے۔ ایسا ہے کہ اس پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ اور سرسری طور پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ جتنا گہرا سوال کا مطالعہ کیا جائے۔ اسی قدر زیادہ ہم اس نتیجہ

پر پہنچتے ہیں کہ سوسائٹی خود خلاف مجلس حرکات کی ذمہ دار ہے اور کوئی سزا- کوئی قید اور کوئی تعزیر انہیں بند نہیں کر سکتی- البتہ سماج کی تجدید' آج ہماری ان حرکات کا جو عدالت میں پیش ہوتی ہیں- 3/4 حصہ کسی نہ کسی طرح پیداوار یا تقسیم دولت کے موجودہ غلط نظام کا مرہون منت ہے- فطرت انسانی کی غلط روی کا نہیں اور نسبتاً "قلیل خلاف مجلس اعمال جو مختلف افراد کے خلاف مجلس رجحانات سے سرزد ہوتے ہیں- تعزیر سے کم نہیں ہو سکتے- بلکہ "بڑھتا ہے ذوق جرم یہاں ہر سزا کے بعد" ہمارے جاسوس' خون بہا' تعزیریں' جیلیں' سوسائٹی میں کمینے جذبات اور عادات کا وہ سیل بے پناہ لے آتی ہیں- کہ جسے ان اداروں کے اثرات سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے- یعنی مجرم حیران رہ جاتا ہے کہ سماج اخلاق کے پردوں میں کیا کر رہا ہے لازمی طور پر ہمیں کوئی اور علاج ڈھونڈھنا چاہیے- اور وہ کبھی کا بتایا جا چکا ہے-" (انارکسٹ کمیونزم)

چھٹا باب

بین الاقوامی تعلقات

بین الاقوامی تعلقات سے دو مقصد پورے ہونے چاہئیں۔ جنگ سے کنارہ کشی اور کمزور قوموں کو زبردستوں کے تشدد سے بچانا۔ یہ دونوں مقصد لازمی طور پر ایک سمت کو نہیں جاتے۔ کیونکہ امن عالم کا ایک آسان ترین طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بڑی بڑی سلطنت دوسروں کو لوٹنے اور دبانے کے لیے اتحاد کرلیں۔ مگر اس طریقہ کو آزادی کے پرستار پسند نہیں کرتے۔ اور ہمیں دونوں مقاصد پر نگاہ رکھنی چاہیے۔

سوشلزم اور انارکزم کا ایک مشترکہ نعرہ یہ ہے کہ تمام موجودہ جنگیں سرمایہ داری کے باعث ہیں اور اگر یہ نہ رہے تو وہ بھی مٹ جائیں۔ میرے خیال میں یہ نظریہ آدھا سچا ہے اور جب سوال سوسائٹی کی بنیادی تجدید کا ہو تو اس سے قطع نظر کہ ایک نصف غیر صحیح ہے دونوں نصف برابر کے اہم ہو جاتے ہیں۔ موجودہ سماج پر نکتہ چینی کرنے والے سوشلسٹ اور انارکسٹ بجا طور پر بعض ایسے سرمایہ دارانہ عناصر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جو جنگ کو بھڑکاتے ہیں۔ ان میں سے پہلا درجہ غیر ترقی یافتہ ممالک میں کاروبار کے نئے میدان تیار کرنے کے لیے دولت کی آرزو ہے۔ مسٹر جے اے ہابسن نے جو اپنے خیالات میں انتہا پسند نہیں ہیں۔ اس بات کو اپنی کتاب "جدید سرمایہ داری کا ارتقاء" میں خوب نبھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں: تمام موجودہ سامراجک پھیلاؤ کا بڑا باعث اور اقتصادی جڑ سرمایہ دار صنعتوں کا پہلے سرمایہ لگانے کے لیے اور پھر ملکی صنعت کی زائد پیداوار کے لیے منڈیوں پر زور دینا ہے۔ جہاں سرمایہ جس قدر مرکز پر آ چلا ہے اور جہاں جس قدر زیادہ مضبوط حفاظتی نظام قائم ہے۔ یہ زور لازمی طور پر بہت قوت

میں ہے۔ ٹرسٹ اور دوسرے دستکاری شعبے جو اپنا مال وطنی منڈی پر تنگ کر دیتے ہیں۔ بیرونی منڈیوں کے لیے ہی نہیں۔ بلکہ محفوظ منڈیوں کے حاصل کرنے کو بھی مضطرب ہوتے ہیں۔ اور اسی صورت میں ممکن ہے کہ سیاسی حکمرانی کو وسیع کیا جائے۔ امریکہ کی خارجہ پالیسی میں تبدیلی کا راز یہی ہے۔ جیسا کہ ہسپانوی جنگ' فلپائن کا الحاق' پانامہ پالیسی اور جنوبی امریکی کہ ریاستوں پر منرو سکیم کو چسپاں کرنے سے ظاہر ہے۔ جنوبی امریکہ ایک اچھی منڈی ہو سکتا ہے۔ اگر کسی وقت یہ ریاستیں ممالک متحدہ کی سرپرستی میں آ جائیں تو اقتصادی کاروبار کو بڑی مدد مل سکتی ہے۔ امریکہ کے دوربین کاروباریوں کو چین میں ریلوں کا کام شروع کرنے اور عام صنعتی نشوونما کے لیے میدان بہت وسیع نظر آ رہا ہے۔ اس ملک میں امریکہ کی روئی کی بڑھتی ہوئی تجارت اور دوسری اشیاء کا خیال کاروباری رقبہ کو وسیع کرنے کے ساتھ ضمنی طور پر ہو گا۔ ڈپلومیٹک دباؤ۔ مسلح فوج اور جہاں مناسب ہو سیاسی کنٹرول کے لیے ملک پر قبضہ کر لینا ان پونجی پتیوں کے ہاتھ میں ہوگا۔ جو امریکہ کی سیاسی زندگی کے مالک ہیں۔ مضبوط اور گراں قیمت امرکن بیڑا جو اب بننا شروع ہوا ہے۔ گو ضمنی طور پر جہاز سازوں اور دھات کا کام کرنے والوں کو نفع مند ٹھیکے دینے کا مقصد پورا کرتا ہے۔ مگر اس کا اصل مقصد اس سیاسی تشدد کی پالیسی کو ایڑ لگانا ہے۔ جو قوم پر سرمایہ داروں کی اقتصادی ضرورتوں نے عائد کر رکھی ہے۔

یہ خوب سمجھ لینا چاہیے۔ کہ منڈیوں کا رقبہ بڑھانے کے لیے یہ مسلسل دباؤ منظم صنعت کی تمام شکلوں میں ضروری نہیں ہے۔ اگر مقابلہ کی رسم کو اڑا کر اس کی جگہ امداد باہمی کا اندازہ اپنایا جائے۔ جس میں کل نفع مزدوروں کو اجرت کی شکل میں یا حصہ داروں کی بڑی جماعتوں کو حصہ کی شکل میں مل جایا کرے تو وطنی منڈیوں میں مال کی مانگ اس قدر بڑھ جائے گی کہ مرکزی سرمایہ کی پیداواری قوتوں سے پورا فائدہ اٹھایا جا سکے گا۔ اور دولت کے انبار قرض کی نئی شکلیں نہ لیں گے اور نہ دساور کی منڈیوں کی تلاش ہو گی۔ یہ ٹرسٹ اور بیوپاری اکٹھوں کے تعمیر اور اقتصادی بیوپار یا صنعتی کام

سے حاصل کیے ہوئے اجارہ داری نفع ہیں۔ جو خود رو کریڈٹ کا جمع شد فنڈ بنتے ہیں۔
جس پر بیوپاری جماعت کا قبضہ اجناس کی ٹھیکہ کی گئی مانگ اور اسی مقدار سے امریکہ کی
صنعتوں میں سرمایہ کو کم صرف کرنے ی صورت میں ہوتا ہے۔ کسی حد تک تجارت
برآمد کو بڑے مفید محصول کے ذریعے (جو ملکی منڈیوں کی اجارہ داری میں ہرمداخلت کو
ممنوع قرار دیتا ہے) حرکت دینے سے سہارا مل جاتا ہے۔ لیکن اپنے وطن کی پر نفع
منڈی کی ضرورتیں پوری کرنے والے ٹرسٹوں کے لیے آزاد مقابلہ کے اپنے طریقوں کو
دنیا کی منڈیوں میں کامیاب طور پر چلانا بہت دشوار ہے۔ اس کے علاوہ پھیلنے کا یہ انداز
خاص خاص دستکاری ٹرسٹوں کے حسب حال ہے۔۔۔۔ ریلوے لائنوں کے ساہوکار
مالکوں اور دوسرے ٹرسٹوں کا اپنے زائد منافعوں کو غیر ملکی کاروبار میں لگانے کی طرف
دھیان رکھنا یقینی ہے یہی کاروبار کے نئے میدان تلاش کرنے کی ہر لمحہ بڑھتی ہوئی
خواہش ساہوکاری نظام کی سب سے بڑی الجھن ہے۔ اور اندیشہ ہے کہ امریکہ کی
آئندہ سیاست اور معاشیات پر چھا نہ جائے۔

امریکہ کی سرمایہ داری کا ساہوکاری بندوبست زیادہ ڈرامائی رنگ میں وہی رجحان
ظاہر کر رہا ہے جو تمام ترقی یافتہ صنعتی قوموں میں عام ہے۔ برطانیہ' جرمنی' آسٹریا'
فرانس وغیرہ سے جنوبی افریقہ میں۔ آسٹریلیا کی کانوں میں مصری بانڈوں میں یا جنوبی
امریکہ کی جمہوریتوں کی غیر یقینی ضمانتوں میں سرمایہ کی آسان کھپت اس عام دباؤ کی
تصدیق کرتی ہے۔ جو ساہوکاری مشینری اور پیشہ ور ساہوکاروں کی جماعت کے اس
مشینری پر نفع بخش اختیار کے ساتھ بڑھتا ہے۔

یہ حالات کیونکر جنگ پیدا کر دیتے ہیں۔ مسٹر ہابسن زیادہ جدید مثالوں سے واضح کر
سکتے تھے۔ اگر اس کتاب کو ذرا بعد میں لکھتے۔ غیر ترقی یافتہ ممالک میں زیادہ سے زیادہ
نفع حاصل ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ غیر مستحکم حکومت کے خطرات کم کیے جا سکیں۔ اور ان
خطروں کو کم کرنے کی خاطر سرمایہ دار اپنے ملک کے فوجی بیڑوں کو اور اوپر بلا لیتے ہیں۔
جنہیں وہ وقتی طور پر اپنے کہتے ہیں اور اس مطالبہ پر لوگوں کی حمایت حاصل کرنے

کے لیے ان کے پاس پریس ہوتا ہے۔

سرمایہ داری کو جنگ کا سرچشمہ ثابت کرنے میں پریس وہ دوسرا جز ہے جس کا مخالف ذکر کرتے ہیں۔ چونکہ ایک بڑے اخبار کے لیے بہت زیادہ سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر بڑے بڑے اخباروں کے مالک سرمایہ دار طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ کم ہی ہوا ہو گا کہ وہ اپنی جماعت سے خیالات و المحال میں ہمدردی نہ رکھیں۔ وہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اخبار بین طبقہ کو کس قسم کی خبریں مہیا کی جائیں۔ وہ خبروں کو غلط کر سکتے ہیں۔ اور اگر ایسا نہ بھی کریں تو بھی بڑی احتیاط سے ان باتوں کو چن سکتے ہیں۔ جو لوگوں کے ان جذبات کو انگیخت دیں۔ جو ان کے لیے مفید ہوں اور اس طرح دنیاکی تصویر' عام اخبار پڑھنے والے کے ذہن میں صحیح نہیں اترتی بلکہ ایسی ہوتی ہے جو سرمایہ داروں کے مفاد کے حسب حال ہو۔ یوں تو یہ بات اکثر پہلوؤں سے درست ہے۔ لیکن قوموں کے تعلقات پر تو بالکل راست آتی ہے۔ ایک ملک کی آبادی کا دوسرے ملک والوں سے محبت یا نفرت کرنا بہت کچھ اخباروں کے مالکوں کے بس میں ہوتا ہے جس میں کسی نہ کسی صورت میں بڑے بڑے پونجی پتیوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ جب تک انگلینڈ اور روس کی بیگانگی کی ضرورت تھی۔ ہمارے اخباروں میں روس کے سیاسی قیدیوں سے ظالم رویہ کے متعلق بڑی بڑی سرخیاں قائم ہوتیں فن لینڈ اور روسی پولینڈ پر تشدد کا ذکر ہوتا لیکن جونہی ہماری خارجہ پالیسی تبدیل ہوئی۔ ان باتوں کا بڑے اخباروں میں کبھی نام تک بھی نہیں آیا اور اب اس کی جگہ جرمنی کی آنکھ کے تنکے چنے جا رہے ہیں۔ عام لوگ ان ریشہ دوانیوں کو تاڑ جانے والے نہیں ہوتے اور اب تک وہ ایسے نہیں ہوں گے۔ پریس کا اقتدار چھایا رہے گا۔

سرمایہ داری کے ان دو اثرات کے علاوہ ایک اور بھی جنگ کو ابھارنے والا ہے جس کا اگرچہ نکتہ چیں شدومد سے ذکر نہیں کرتے۔ تاہم وہ کم اہم نہیں ہے۔۔۔۔۔ میرا مطلب اس جھگڑالو پن سے ہے جو ان لوگوں میں بڑھنے لگتا ہے جو حکم کرنے کی عادت رکھتے ہیں۔ جب تک سرمایہ داری سماج قائم ہے۔ اقتدار نامناسب حد تک ان لوگوں

کے ہاتھوں میں رہے گا۔ جنہوں نے کسی صنعت یا مال میں بڑا عہدہ حاصل کرنے سے دولت اور رسوخ حاصل کیا ہوگا۔ یہ لوگ اپنی پرائیویٹ زندگی میں اپنی بات کا رد کیا جانا برداشت نہیں کر سکتے خوشامدیوں کا ہجوم ان کے گرد رہتا ہے۔ اور تجارت سنگوں سے ان کی اکثر ٹھنی رہتی ہے۔ ان کے دوست بھی عموماً حکومت کے اعلیٰ افسر ہی ہوتے ہیں جو حکم چلاتے رہنے سے اس طرح کے خود سر ہو گئے ہوتے ہیں۔ برائے نام جمہوریت سے پہلے "حاکم لوگ" کی اصطلاح بہت عام تھی۔ اگرچہ آج بھی وہ بالکل مردہ نہیں ہے۔ آج بھی ہر سرمایہ دار جماعت میں بعض وہ ہوتے ہیں۔ جو حکم چلاتے ہیں اور بعض سر جھکاتے ہیں۔ ان دونوں جماعتوں کا زاویہ نگاہ جدا جدا ہے اگرچہ موجودہ سوسائٹی میں ایک کی انتہا سے دوسری کی انتہا تک مسلسل زینے بن چکے ہیں۔ جس شخص کے اشاروں پر ہمیشہ سر جھکتے رہیں۔ مخالفت پر اس کا آپے سے باہر ہو جانا یقینی ہے۔ وہ دل میں بٹھا چکا ہوتا ہے کہ مخالفت فتنہ ہے اور اسے کچل دینا چاہیے۔ اس لیے وہ اپنے حریفوں کے خلاف لڑائی مچا دینے میں عام شہریوں سے زیادہ پیش پیش ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں۔۔۔۔ اگرچہ بعض مستثنیٰ بھی ہیں۔۔۔۔ کہ عموماً زیادہ طاقتور ہی زیادہ لڑاکے ہوتے ہیں اور کم طاقت والے ملک دوسری قوموں کو کم نفرت سے دیکھنے والے ہوتے ہیں طاقت کی مرکزیت میں یہ بہت زبردست نقص ہے اور اس کا علاج سرمایہ داری کو ختم کر دینے ہی سے ہو سکتا ہے۔ نہ کہ سرمایہ داری کی جگہ عہدہ دار کھڑے کر دینے سے اور حکومت کے اختیارات محدود کرنے کی خواہش کا ایک بڑا باعث یہ بھی ہے۔

لیکن طاقت کی مرکزیت ہی جنگ کا باعث نہیں بنتی۔ بلکہ جنگ اور اس کا اندیشہ طاقت کی مرکزیت کو ضروری کر دیتا ہے۔ جب تک جماعت فوری خطروں کی زد میں ہے۔ ذاتی حفاظت کے لیے فوری فیصلہ کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ آڑے وقت میں ناممکن ہے کہ لوگوں کے غوروخوض سے دیئے ہوئے فیصلوں کو چلایا جائے۔ اس لیے جب تک کٹھن لمحے ممکن ہیں۔ حکومت کی خود سرانہ طاقت کو بالکل مٹا دینا ناممکن

ہے۔ اس صورت میں دوسری کئی صورتوں کی طرح مرض دوا کو ضروری کر دیتا ہے اور دوا مرض بڑھاتی ہے۔ خود سر لوگوں کا وجود لڑائیوں کا خطرہ پیدا کر دیتا ہے۔ اور لڑائیوں کا خطرہ ایسے نظام کا قائم کرنا ناممکن کر دیتا ہے جس میں کسی کے ہاتھ میں قوت نہ ہو۔

اب تک ہم یہ سمجھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ یہ کہاں تک درست ہے کہ سرمایہ داری موجودہ جنگوں کا باعث ہے۔ اب دوسری طرف بھی نظر ڈالنی چاہیے کہ کیا صرف سرمایہ داری کو ختم کر دینا جنگ روکنے کے لیے کافی ہوگا؟

میرا خیال ہے کہ اس معاملہ میں بھی بعض اور باتوں کی طرح سوشلسٹوں اور انارکسٹوں کا خیال فطرت انسانی کے بنیادی جذبات سے بہت دور رہے۔ سرمایہ داری سے پہلے بھی لڑائیاں ہوا کرتی تھیں اور حیوانوں میں یہ کس قدر عام ہیں۔ پریس کی لڑائی ابھارنے کی طاقت محض اس لیے ہے کہ لوگوں میں ایسے جذبات موجود ہیں۔ انسان قدرتی طور سے مقابلہ کرنے والا۔ حریص اور کسی حد تک جھگڑالو ہے۔ جب پریس اسے بتاتا ہے کہ فلاں اس کا دشمن ہے تو اس کے جذبات فوراً" صادر کر دیتے ہیں۔ یہ خیال بعض لوگوں میں قدرتی ہے کہ ان کے بعض دشمن بھی ہیں اور مقابلہ کرنے سے انکا فطری تقاضا پورا ہوتا ہے۔ ناکافی ثبوت پر بھی کسی بات کو مان لینا اصل میں اپنی آرزوؤں کا پرتو ہوتا ہے۔۔۔۔ ایسی آرزوئیں جن کا بسا اوقات اسے خود بھی احساس نہیں ہوتا۔ اپنے جذبات کے خلاف کوئی واقعہ ملے۔ تو اس کی خوب مین میخ نکالی جاتی ہے۔ اور اگر ثبوت بہت زیادہ چھا جانے والا نہ ہو تو ماننے سے انکار کر دیا جاتا ہے۔ اس کے خلاف اگر اپنے موافق ذرا سا اشارہ بھی ملے۔ تو اسے ضعیف سے ثبوت پر بھی قبول کر لیا جاتا ہے۔ پرانے قصے کہانیوں اور مذہبی انسانون کی حقیقت یہی ہے۔ اور بین الاقوامی امور کا اکثر حصہ اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اگرچہ سرمایہ داری موجودہ سوسائٹی میں وہ فضا پیدا کر دیتی ہے۔ جو جھگڑوں کو راس آتی ہے۔ تاہم یہ اندیشہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر اس فضا کو ختم کر دیا گیا تو کوئی اور پیدا ہو جائے گی۔ جب تک تعلیم اور ماحول کو ایسا نہ بدل دیا جائے۔ کہ مقابلہ کرنے کے جذبات طاقت میں نہ

رہیں اگر کوئی اقتصادی تنظیم اس میں کامیاب ہو جائے تو جنگ رک سکتی ہے۔ ورنہ امن عالم کا خیال ایک خواب ہے۔

سرمایہ داری کا خاتمہ ممکن ہے پریس اور غیر ترقی یافتہ ممالک میں کاروبار کے نئے میدان ڈھونڈنے کے لیے سرمایہ کی خواہش سے پھوٹی ہوئی جنگی امنگیں کو کم کر دے۔ لیکن جو حکم اور مخالفت کو برداشت نہ کرنے سے پیدا ہوں گی۔ ممکن ہے زندہ رہیں۔ اگرچہ آج سے کم قوت میں بااختیار جمہوریت ہمیشہ بے اختیار جمہوریت سے زیادہ سبزوپسند ہوتی ہے۔ مارکس کی بین الاقوامیت کی بنیاد یہ خیال ہے کہ پرولتاریہ کی مخالفت ہر جگہ حکمران جماعتیں کرتی ہیں۔ "اشتراکی اعلان" کے آخری الفاظ اس خیال کی تفسیر ہیں: "پھر اشتراکی انقلاب پر حکمران جماعتیں کانپتی ہیں تو کانپیں۔ پرولتاریہ کے پاس زنجیروں کے سوا ہے کیا جو کھویا جائے گا۔ اور ایک دنیا ان کے جیتنے کے لیے ہے۔ دنیا کے مزدورو! ایک ہو جاؤ۔" اور جب تک پرولتاریہ کے پاس زنجیروں کے سوا کچھ نہیں۔ جو کھویا جائے وہ دوسرے پرولتاریہ کے خلاف نہیں جا سکتے۔ اور اگر دنیا اسی انداز سے بڑھتی جس طرح مارکس کو توقع تھی۔ تو ممکن تھا کہ اس کی بتائی ہوئی بین الاقوامیت عالمگیر سماجی انقلاب پیدا کر دیتی۔ صرف روس میں اس قسم کا انقلاب ہوا جس کی اسے توقع تھی۔ کیونکہ وہی ملک اس کے بتائے گئے انداز میں بڑھا۔ اگر دوسرے ممالک میں بھی یہی کیفیت ہوتی تو بہت اغلب تھا کہ انقلاب ساری مہذب دنیا پر چھا جاتا۔ تمام ملکوں کے پرولتاری سرمایہ داروں کو اپنا مشترکہ دشمن جان کر ان کے خلاف ہو جاتے اور آپس کی نفرت سے وقتی طور پر چھٹکارا پا جاتے اگرچہ فتح کے بعد یہ اتحاد ٹوٹ جاتا اور معاشری انقلاب کی اگلی سحر قدیم قومی تعصبات پھر زندہ ہو جاتے کیونکہ ایسا کوئی پارس نہیں ہے جو نفرت میں سے عالمگیر ہم آہنگی پیدا کر دے۔ جماعتی لڑائی کے ابھارے ہوؤں میں نفرت طبیعت ثانی بن چکی ہوتی۔ اور پرانے دشمنوں کے بعد قدرتی طور پر وہ نئے دشمنوں کی تلاش کرتے۔

لیکن حقیقت میں مغربی جمہوریتوں کے مزدور کی نفسیات اس سے بالکل جدا ہیں

جس کا اشتراکی اعلان میں ذکر کیا گیا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ وہ کچھ نہیں کھوئے گا مگر پاؤں کی بیڑیاں اور نہ یہ درست ہے۔ جو زنجیریں ایشیا اور افریقہ کو یورپ کی اطاعت میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ان کو کسنے میں اس کا بھی ہاتھ ہے۔ ظلم اور لوٹ کھسوٹ کی ایک بڑی مشین کا وہ بھی پرزہ ہے عالمگیر آزادی صرف اس کی زنجیریں ہی نہیں توڑے گی۔ جو نسبتاً بہت ہلکی ہیں۔ بلکہ ان بوجھل بیڑیوں کو بھی توڑ پھوڑ کر رکھ دے گی۔ جن سے دنیا کی غلام نسلوں کے پاؤں باندھنے میں اس نے مدد دی ہے۔

انگلینڈ ایسے ملک کے مزدوروں کا پست نسلوں کی لوٹ کھسوٹ سے حاصل کیے ہوئے نفع میں حصہ نہیں۔ بلکہ ان میں سے اکثر کا سرمایہ داری نظام میں بھی حصہ ہے۔ تجارت سنگوں اور امداد باہمی سوسائٹیوں کے فنڈ عام کاموں مثلاً ریلوں وغیرہ میں لگائے گئے ہیں۔ بہت سے اچھی اجرت والے مزدوروں نے حکومت کے خزانوں میں روپیہ جمع کرایا ہوا ہے۔ تقریباً" تمام سیاسی بیداری رکھنے والے مزدور پارٹی اور دوسری انجمنوں کے ذریعے اپنے آپ کو جمہوری پالیسی کے چلانے والوں میں سے شمار کرتے ہیں اس سبب سے ان کا زندگی کا نظریہ بہت حد تک سرمایہ دارانہ رنگ لے چکا ہے اور طاقت کے احساس کے ساتھ ان کی قوم پرستی بڑھ گئی ہے۔ یہی بات ہر اس بین الاقوامیت پر راست آتی ہے۔ جس کی بنیاد سرمایہ داروں سے نفرت اور جماعتی جنگ کا فلسفہ ہو۔ اگر حکمران جمہوریتوں کو ماضی کی حکمران جماعتوں کی برائیوں سے بچنا ہے۔ تو اس کے لیے کسی زیادہ مثبت اور تعمیری چیز کی ضرورت ہے۔

میں اس سے منکر نہیں ہوں کہ سرمایہ داری جنگوں کو زیادہ کرتی ہے۔ اور اگر ذاتی ملکیت نہ رہے تو شاید لڑائیاں شاذ اور کم تباہ کن ہو جائیں۔ بلکہ میرا تو ایمان ہے کہ زمین اور سرمایہ کی نجی ملکیت کا خاتمہ قوموں کے آرام سے دن گزارنے کے لیے ایک ضروری قدم ہے۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ اقدام کتنا ضروری سہی۔ لیکن تنہا جنگ کو ختم کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کیونکہ اس کے علاوہ اور بہت سے اسباب ہیں جو انسانی فطرت میں ان سے کہیں زیادہ رچ چکے ہیں۔ جن کا پکے

سوشلسٹوں کو اعتراف ہے مثال کے طور پر آسٹریلیا اور کیلی فورنیا میں زرد نسلوں کو نفرت اور خوف سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے اسباب مختلف ہیں۔ جن میں محنت کے لیے مقابلہ اور جبلی نسلی نفرت زیادہ اہم ہیں۔ اور یہ ممکن ہے کہ اگر نسلی نفرت نہ رہے تو شاید محنت کی الجھنیں دور ہو جائیں۔ بکھری ہوئی قلیل سی آبادی والے ملک میں سستی صنعت اس طرح کام میں لائی جا سکتی ہے کہ وہاں کے باشندے مال مال ہو جائیں۔ مثلاً اسے قانون کے ذریعے نہ سہی رواج کے ذریعے چند کاموں کے لیے وقف کر دیا جائے لیکن نسلی نفرت ان میں مقابلہ کی برائیاں پیدا کر دیتی ہے اور اتحاد کے فوائد سے وہ آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ اجنبیوں کی غیرمانوس کمزوریوں کو ایک سہم کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ لیکن ہماری اپنی خامیاں برداشت کر لی جاتی ہیں۔ میرا تو یہی خیال ہے کہ اگر آسٹریلیا بالکل سوشلسٹ بھی ہو جائے تو بھی آج کی طرح چینی اور جاپانی مزدوروں کے اڈ آنے کو اسی اعتراض سے دیکھا جائے گا۔ لیکن اگر جاپان سوشلسٹ حکومت بن جائے تو بھی جاپانیوں کو آبادی کے زور کے سبب نکاس کی خواہش ہو گی۔ اور ان حالات کے ہوتے ہوئے دونوں ملکوں میں سوشلزم کا قائم ہو جانا بھی جنگی جذبات و مفاد کو زندہ رکھے گا۔ چیونٹیاں اتنی سوشلسٹ ہیں کہ کوئی جماعت کیا ہو گی لیکن وہ بھی ہمسایہ "چیونٹی گھر" سے بھٹک کر آئی ہوئی چیونٹی کو مار ڈالتی ہیں اور انسان بھی جذبات کے لحاظ سے ان سے بہت جدا نہیں ہیں۔ بلا شبہ نسلی مخالفت کا جذبہ مناسب فضا میں اور ہو سکتا ہے۔ لیکن اسی فضا کی عدم موجودگی میں یہ امن عالم کے لیے بڑا خطرہ ہے۔

اگر امن عالم کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکتا ہے تو اسی صورت میں کہ مجلس اقوام کا سا کوئی خیال بھی دوسری تبدیلیوں کے ساتھ رواج پا جائے جوں جوں وقت گزرتا ہے۔ جنگ کی تباہ کاریاں زیادہ اور نفع کم ہوتا جاتا ہے۔ جوں جوں محنت کی بڑھتی ہوئی پیداواری قوت آبادی کے کثیر حصہ کو باہمی کشت و خون میں گزرنا ناممکن کر رہی ہے۔ جنگ کے خلاف عقلی دلیل زور پکڑ رہی ہے۔ امن کے دنوں میں یا جب کوئی بڑی لڑائی ختم ہی ہوئی ہو۔ لوگ امن کی طرف خود بخود جھکنے لگتے ہیں۔ اور اسی وقت ایسی

اسکیمیں کامیاب کرنا ممکن ہے۔ جو جنگ کو کم پذیر کر دیں۔ غالباً" کوئی مہذب قوم جنگ میں کودنا پسند نہ کرے۔ اگر یہ یقین ہو کہ ظالم کو ضرور شکست ہو گی اور یہ جبھی ہو سکتا ہے کہ بڑی بڑی قومیں امن عالم کو اتنا سمجھیں کہ کسی ذاتی سروکار کے بغیر بھی وہ ظالم کے خلاف لڑائی میں صفیں باندھنے کو تیار ہو جائیں۔ اسی امید پر لیگ آف کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

لیکن ذاتی ملکیت کے خاتمہ کی طرح نری لیگ آف ہی کافی نہیں ہو گی اگر اور اصلاحیں نہ کی جائیں اور یہ ظاہر ہے کہ وہ اصلاحیں جبھی ہو سکتی ہیں اگر بین الاقوامی ہوں۔ اگر دنیا کو حرکت میں آنا ہے۔ تو اسے ایک ساتھ آنا چاہیے اس سلسلے میں سب سے ضروری تخفیف اسلحہ ہے۔ جب تک موجودہ طبی چوڑی فوجیں اور جنگی بیڑے ہیں کوئی طریقہ جنگ کے خطرہ کو نہیں روک سکتا۔ لیکن تخفیف اسلحہ کا مقصد اسی وقت پورا ہو سکتا ہے۔ جب تمام بڑی طاقتیں اسے بیک وقت کر دیں اور اس کی کامیابی کا اسی وقت امکان ہو سکتا ہے جب قوموں کے درمیان سے شک اور نفرت کا پردہ اٹھ جائے۔ ورنہ ہر قوم دوسرے کی نیت پر شک کرے گی۔ قوموں کے سمجھوتے اس صورت میں تباہ کاریں کو روک سکتے ہیں۔ جب بین الاقوامی معاملات میں آج سے مختلف دماغی اور اخلاقی فضا پیدا کی جائے ایک بار یہ فضا بندھ جائے پھر اسے سمجھ داراداروں کے ذریعے مضبوط کیا جا سکتا ہے لیکن تنہا ادارے اسے پیدا نہیں کر سکتے۔ بین الاقوامی تعاون کے لیے باہمی نیک نیتی کی ضرورت ہے۔ اور نیک نیتی باہمی تعاون سے برقرار رہ سکتی ہے بین الاقوامی مستقبل کا انحصار قوموں کے مابین نیک نیتی کے پیدا ہو جانے پر ہے۔

ایسی باتوں کے لیے انقلاب بہت مفید رہتے ہیں۔ اگر روسی انقلاب کے ساتھ ہی جرمنی میں بھی انقلاب ہو جاتا تو شاید تغیر کی یہ ڈرامائی یک لخت یورپ کو وقتی طور پر اس کے انداز تخیل سے جھنجھوڑ دیتی۔ اخوت کا تصور ایک جھپک میں عملی سیاست کی دنیا میں در آتا دکھائی دیتا۔ اور انسانی اخوت سے بڑھ کر کوئی تصور کار آمد نہیں۔ اگر

ملک اس پر آکسائے جا سکیں۔ ایک بار قوموں کے درمیان اخوت کا تصور اس ایمان اور قوت کے ساتھ جاری ہو جائے جو نئے انقلاب کا خاصہ ہیں۔ تمام دشواریاں پگھل جائیں۔ کیونکہ تمام کا باعث شک اور قدیم تعصب ہے۔ جو لوگ (جیسا کہ انگریزی زبان والی دنیا میں عام ہے) انقلاب کے طریقہ کو ناپسند کرتے ہیں اور "دھیرے دھیرے تھوڑی تھوڑی رفتار" کی تعریف کرتے ہیں۔ جسے وہ ٹھوس ترقی گنتے ہیں۔ آبادیوں کے عقائد کو تبدیل کرنے میں ڈرامائی واقعات کی اہمیت بھول جاتے ہیں۔ جرمنی اور روس میں بیک وقت انقلاب کا ایسا ہی اثر پڑتا اور نئی دنیا پیدا کرنا آج سے کہیں زیادہ ممکن ہو جاتا۔

جنت کے خواب کی تعبیر ہمارے لیے نہیں ہے۔ قبولیت کا وقت گزر چکا۔ اور اب پھر امید کہیں دور کھڑی ہمیں ابھارا کرے گی۔ لیکن ہم نے دیکھ لیا ہے کہ بہت کچھ ہو سکتا تھا اور ہم جانتے ہیں کہ بحران کے وقتوں میں بہت امکانات پیدا ہو جاتے ہیں کسی ایسی ہی ادا اور وقت میں یہ درست ہو سکتا ہے کہ سوشلسٹ انقلاب عالمگیر امن کی طرف جانے والی سڑک ہے' اور جب اسے طے کر لیا گیا تو جنگوں کو روکنے کی باقی صورتیں بدلی ہوئی اخلاقی اور دماغی فضا سے از خود پیدا ہو جائیں گی۔

با سمجھ مثال پرست مستقبل کی طرف نظر اٹھاتا ہے تو اسے مشکلات کے خاص طرز کے بادل امڈے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اور صاف مطلع کی طرف سے وہ مایوس ہو کر رہ جاتا ہے۔ ادھر موجودہ ناہمواریوں کو قائم رکھنے والے اس اندھیاری کو اور دیرپا کر دیتے ہیں---- افریقہ کی مثال میرا مطلب واضح کر دے گی دنیا کے اس حصہ میں پارلیمانی حکومت جاری کر دینا بہت دشوار ہے۔ خواہ اس میں عورتوں کو بھی حق رائے دہی کیوں نہ دے دیا جائے۔ جہاں تک مجھے علم ہے۔ لائڈ جارج کے سوا کوئی بھی اس خیال کا نہیں کہ ان طبقوں کی آبادی اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے قابل ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ یورپ میں کوئی طرز حکومت بھی قائم کیا جائے۔ افریقہ کے حبشی ایک عرصہ تک یورپ والوں کے ماتحت رہیں گے اگر یورپ کی حکومتیں سوشلسٹ ہو

جائیں اور ذاتی مفاد سے بے نیاز ہو کر افریقہ کے نہتے باشندوں کے خرچ پر مالا مال ہونے سے انکار کر دیں۔ تو ان باشندوں کو فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہو گا۔ کیونکہ پھر وہ انفرادی تاجروں کے رحم پر ہوں گے۔ جن کے پاس سنگ دل تنخواہ دار قاتلوں کی فوجیں ایسی ایسی سفاکیاں کرتی ہوں گی کہ ان کے سامنے مہذب ڈاکو ماند ہیں۔ یورپ کی حکومتیں افریقہ کے متعلق اپنی بے تکلفی کا اعلان نہیں کر سکتیں۔ وہاں ان کی حکومت ضرور ہونی چاہیے۔ البتہ یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ظلم و ستم نہ ہونے پائے۔ امن عالم قائم رکھنے کے نقطہ نظر سے ضروری ہے کہ وہاں سے اخذ کیے گئے منافع کو قوموں میں اس طرح بانٹ دیا جائے کہ کسی کو شکایت نہ رہے یہ مسئلہ نسبتاً آسان ہے اور باہمی متحدہ سوشلسٹوں کے جنگی مقاصد کے خطوط پر حل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن میں اس پر بحث نہیں کرنا چاہتا بلکہ یہ غور کرنا چاہتا ہوں کہ سوشلسٹ یا انارکسٹ جماعت افریقہ کے قدرتی دولت سے بھرپور لیکن غیر مہذب آبادی سے بسے ہوئے خطوں میں کیونکر حکومت کر سکے گی۔ جب تک بہت احتیاط نہ کی جائے اس فضا میں سفید لوگوں کا اقتدار حاصل کر لینا اور غلام سازی کے جذبات کا ابھر پڑنا غیر ممکن نہیں ہے اس طرح حبشیوں کو محض روٹی پر رکھا جائے گا۔ اور ان کے ملک کی پیداوار کو اشتراکی جماعت کی آسائش بڑھانے میں صرف کیا جائے گا۔ اور یہ سب کچھ اس چالاک تحت الشعور کے ماتحت ہو گا۔ جو آج قوموں کے تمام بڑے کاموں کی جڑ ہے۔ انتظام کرنے والے مقرر کیے جائیں گے۔ لیکن اپنی کاروائیوں کے متعلق ان سے چپ رہنے کی توقع کی جائے گی۔ چغلی خوروں کا جو ہولناکیوں کی رپورٹ کریں گے یقین نہ کیا جائے گا اور ان پر موجودہ نظام کی نفرت کا الزام لگایا جائے گا نیا نظام قائم کرنے کی پہلی نیک تڑپ میں تو بے شک ملکیوں کی فلاح کے ارادے چھپے ہوں گے۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ بھلا دیئے جائیں گے۔ اور ان کے ملک سے لیا گیا خراج ہی یاد رہ جائے گا۔ لیکن یہ نقص لاعلاج نہیں۔ البتہ اس کو رفع کرنے کے لیے پیش بینی اور دانشمندانہ اقدام کی ضرورت ہے۔ اگر کبھی سفید نسلیں حتی الامکان ان اصولوں پر عمل کرنا چاہیں۔ جو سرمایہ داروں کے

خلاف بغاوت کی تہہ میں ہوتے ہیں تو انہیں ماتحت نسلوں کے ساتھ برتاؤ میں بے غرض رہنا پڑے گا۔ افریقہ میں سرمایہ داری نفع کا دھندلا سا خیال بھی دبا دینا پڑے گا اور صحن کی مٹی صحن میں ہی لگانی پڑے گی اس کے علاوہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تمدنی پس افتادگی لاعلاج نہیں ہے اور وسطی افریقہ کی آبادی بھی ایک دن جمہوری خودمختاری کے قابل ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ یورپ والوں کی نیتیں نیک ہوں۔

افریقہ کا مسئلہ سامراج کے دورافتادہ مسائل میں سے ہے۔ لیکن اسی مقام پر سوشلسٹ اصول برتنے کٹھن نظر آتے ہیں۔ ایشیا اور بالخصوص ہندوستان اور ایران میں ان اصولوں کا استعمال تھیوری میں تو صاف ہے۔ البتہ عملاً" مشکل سا ہے۔ جو دشواریاں خود مختاری کی راہ میں افریقہ میں ہیں۔ بہت حد تک ایشیا میں نہیں ہیں۔ ایشیائی آبادی کی غلامی کا باعث ذہانت کی کمی نہیں صرف فوجی کمزوری ہے۔ جو انہیں ہماری ہوس استعمار کا شکار بنا دیتی ہے۔ سوشلسٹ انقلاب کی اگلی سحر ہوس سے شاید مر جائے اور اس وقت ایشیا کے متعلق مستقل اور مفید نتائج کو سامنے رکھ کر نئی پالیسی اختیار کی جا سکتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہندوستان پر وہی جمہوری حکومت ٹھونس دی جائے جو ہم نے اپنے لیے موزوں کی ہوئی ہے۔ البتہ ہمیں ہندوستان کو آزاد چھوڑ دینا چاہیے وہ خود اپنی حکومت چنے تعلیمی طریقے ایجاد کرے اور اپنی پسند کی تہذیب اختیار کرے۔ ہندوستان کی اپنی تہذیب ہے جو مغربی تہذیب سے بہت جدا ہے۔ اور تعلیم یافتہ ہندو اس کی قدر کرتے ہیں۔ اگرچہ ہمارے سکول اور کالج اسے پسند نہیں کرتے۔ ہندو قوم پرست محسوس کرتا ہے کہ اس کے ملک کا کلچر وہ جوہر رکھتا ہے جو مغرب میں نہیں ہیں یا بہت کم ہیں۔ وہ انہیں زندہ کرنے کے لیے آزاد ہونا چاہتا ہے۔ اس کی سیاسی آزادی کی تڑپ کا بڑا سبب یہی ہے۔ یورپ کا اپنے کلچر میں اعتقاد خبط کی حد تک پہنچ چکا ہے اور اس لیے بھی غیر یورپی تہذیب کی آزادی دنیا کے لیے اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ بے جان ہمواری دنیا کو مالا مال نہیں کر سکتی۔

میں نے امن عالم کی راہ میں روکاوٹوں کا پورے طور سے ذکر کر دیا ہے اور اس

لیے نہیں کہ میں انہیں اٹل سمجھتا ہوں۔ بلکہ اس لیے کہ میرے خیال میں ان کو پہچان لینے سے انہیں دور کیا جا سکتا ہے۔ شفا کے لیے صحیح تشخیص بہت ضروری ہے۔

بین الاقوامی تعلقات کی موجودہ خرابیاں نفسیاتی اسباب سے پھوٹتی ہیں۔ ان کا باعث وہ جذبات ہیں۔ جو آج فطرت انسانی کا حصہ بن چکے ہیں۔ ان میں سے موٹے موٹے یہ ہیں۔۔۔۔ مقابلہ اقتدار کی خواہش اور حسد جس میں وہ جبلی ناپسندی بھی شامل ہے۔ جو کسی کو فائدہ ہوتے دیکھ کر پیدا ہو جاتی ہے اگر اس میں اپنی ذات کو بھی اسی قدر نفع نہ ہوا ہو۔ ان تینوں اسباب سے اٹھتی ہوئی خرابیوں کو اچھی تعلیم اور اچھے معاشی اور سیاسی نظام سے دور کیا جا سکتا ہے۔

مقابلہ بذات خود برائی نہیں ہے۔ یہ خدمت خلق انکشاف یا فنی مشاغل میں سبقت لے جانے کی امنگ پیدا کر کے لوگوں کو مفید کاموں میں لگانے کا اچھا ذریعہ بن سکتا ہے اور اسی صورت میں نقصان وہ ہے جب ان اشیا کے حاصل کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ جو مقدار میں محدود ہوں۔ کیونکہ اس صورت میں ایک کا قبضہ دوسرے کی بے دخلی ہوتی ہے۔ جب مقابلہ یہ نوعیت اختیار کر جاتا ہے تو خوف بھی ساتھ آ دھمکتا ہے اور خوف میں سے ظلم کا پھوٹ پڑنا اٹل ہے۔ لیکن مادی اشیا کی زیادہ عادلانہ تقسیم والے سماجی نظام میں مقابلہ کا جذبہ ممکن ہے ان رستوں کو جانے سے رکا جائے جو رترکستان کو جاتے ہیں۔ سرمایہ اور زمین کی اجتماعی ملکیت کا انسانی فطرت پر اچھا اثر پڑنے کی یہ ایک بڑی دلیل ہے۔ کیونکہ انسانی طبیعت کوئی محور نہیں ہے بلکہ حالات تعلیم اور موقعہ کی پیداوار ہے جو اثر قبول کر لینے والی سادہ فطرت کو رنگ دیتے رہتے ہیں۔

یہی کیفیت قوت کی خواہش ہے۔ قوت کی وہ شکل جس کی عموماً آج کل تلاش کی جاتی ہے۔ حکم کرنے کی قوت ہے۔۔۔۔ کھلے بندوں یا درپردہ اپنی مرضی کو دوسروں پر ٹھونسنے کی قوت۔ قوت کی یہ صورت دوسروں کو دھمکانے سے ترکیب پاتی ہے۔ کیونکہ اس کا اسی وقت اظہار ہوتا ہے۔ جب دوسروں کو اس کام کے کرنے پر مجبور کیا جائے۔ جسے وہ نہ کرنا چاہتے ہوں۔ ہمیں امید ہے کہ سرمایہ داری کے بعد ہم جس نظام

کو دکھنا چاہتے ہیں اس میں یہ قوت ان ذرائع سے جو پچھلے باب میں بیان کیے جا چکے ہیں۔ بہت کم ہو جائے گی۔ وہ طریقے قومی معاملات اور بین الاقوامی تعلقات میں یکساں طور پر استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ انٹرنیشنل معاملات میں وفاقیت کا وہی فارمولا برتا جائے گا کہ ہر طبقہ کو ان معاملات میں کامل آزادی ہو گی۔ جن کا تعلق دوسروں کی نسبت اس سے زیادہ ہو گا۔ حکومت غیر جانبدار ہو گی اور ایسے معاملات میں تمام طبقوں کو ساتھ لیا کرے گی۔ جن میں ان طبقوں کے مفاد ٹکرا جائیں لیکن ہمیشہ اس کے سامنے ایک اصول ہو گا کہ حکومت کی ذمہ داریاں اس حد تک گھٹا دینی چاہئیں۔ جہاں تک انصاف اور نجی تشدد کی روک تھام اجازت دے۔ ایسی دنیا میں قوت کی خواہش کے موجودہ نقائص نہ رہیں گے لیکن ترغیب تعلیم نئی عقل کی طرف رہنمائی یا مسرت کے نئے امکانات کو پا جانے کی قوت---- جو خیر محض ہے۔ جوں کی توں رہے گی اور بہت سے اولوالعزم جو آج اپنی قوتوں کو تسلط میں صرف کرتے ہیں۔ اس دنیا میں قدیم خرابیوں کو جاری رکھنے کی نسبت نئی بہتریوں کی تحقیق میں لگا ہوا پائیں گے۔

موجودہ دور کی خرابیوں کے اسباب میں تیسری نفسیاتی برائی حسد ہے۔ جو اکثر طبیعتوں میں اس بنیادی بے اطمینانی کا سہارا لیے ہوتا ہے جو آزاد نشوونما کی کمی۔ بھٹکے ہوئے دل اور تصور کی ہوئی مسرت کے نہ پا سکنے سے پھوٹتی ہے۔ اس کا علاج وعظ نہیں ہے۔ وعظ زیادہ سے زیادہ اس کی صورت تبدیل کر کے اسے زیادہ پیچیدہ راز بنا دے گا ان شاذ فطرتوں کے علاوہ جن میں برے حالات کے باوجود وسعت رہتی ہے۔ حسد کا واحد علاج آزادی اور مسرت کی زندگی ہے۔ فراغت اور محبت۔ دھوپ اور ہرے بھرے کھیتوں کی سادہ مسرت سے محروم آبادیوں سے وسعت نظر اور نیک مزاجی کی توقع عبث ہے۔ ایسی آبادی میں یہ جو ہر معدودے چند خوش نصیب لوگوں میں بھی نہیں مل سکتے کیونکہ ان چند کو---- دھندلے طور پر ہی سہی---- معلوم ہوتا ہے کہ وہ ناانصافی کے ذریعے مزے لے رہے ہیں۔ اور ان کی اسی صورت میں چاندی ہے کہ محروموں کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا جائے۔ وسعت اور نیکی دلی کو آج سے زیادہ

عام کرنے کے لیے آج سے کہیں زیادہ فطرت انسانی کی ابتدائی ضرورتوں کو پورا کرنے کی فکر ہونی چاہیے اور یہ سمجھ لینا چاہیے کہ مسرت کا ان لوگوں تک پہنچانا جو کسی خاص بدبختی کا شکار نہیں ہیں۔ ممکن بھی ہے اور ضروری بھی ہے۔ مسرت میں شرابور دنیا لڑائی میں کودنا پسند نہ کرے گی اور اس میں وہ کین پرور مخالفت نہیں ہو گی۔ جس میں آج بگڑی ہوئی اور تنگ زندگی کے سبب عام فطرت انسانی لتھڑی نظر آتی ہے۔ مسرت سے لبریز دنیا پیدا کرنا انسانی قوت سے بعید نہیں ہے---- بے جان قدرت کی عائد کردہ رکاوٹیں ایسی نہیں کہ سر نہ ہو سکیں۔ اصلی رکاوٹیں انسان کے دل میں ہیں۔ اور ان کا علاج ایک ایسی پختہ امید سے ہو سکتا ہے۔ جسے تخیل نے جلا دے کر حصار بند کیا ہو۔

ساتواں باب

سوشلزم میں سائنس اور آرٹ

سوشلزم کو عموماً" مزدوروں کی بھلائی خصوصاً" مادی بھلائی کا ذریعہ بتایا جاتا ہے۔ چنانچہ بعض لوگ جن کے مقاصد مادی نہیں ہیں۔ سمجھنے لگ گئے ہیں کہ آرٹ اور تخیل کے شعبہ میں اسے تہذیب کی عام ترقی سے کوئی ربط نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس کے بعض علمبرداروں نے اور ان میں مارکس بھی شامل ہے کچھ باتیں لکھی ہیں (اگرچہ نادانستہ طور پر) جن سے ٹپکتا ہے کہ گویا سوشلسٹ انقلاب کے ساتھ ابدی آسائش کا دور آ جائے گا۔ اور نسل انسانی کے لیے مزید ترقی کی ضرورت نہیں ہو گی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارا دور ماضی سے زیادہ اضطراب پرور ہے یا ارتقا کی دھن اسے زیادہ ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج ہم تھمی ہوئی تکمیل کو گوارہ نہیں کر سکتے اور ہر سماجی نظام کے لیے بہتر کی جانب ترقی کے لیے موقعہ اور محرم کے جراثیم دیکھنا چاہتے ہیں۔ سوشلسٹ مصنفوں کے پیدا کردہ شکوک اس کی پڑتال ضروری کر دیتے ہیں کہ آیا سوشلزم سچ مچ آرٹ اور سائنس کی دشمن ہو گی اور ایسی سماج قائم کرے گی جس میں ترقی دشوار اور آہستہ ہو جائے گی۔

لوگوں کو مادی ضروریات بہم پہنچانا ہی کافی نہیں ہے۔ آج خوشحال جماعتوں کے اکثر انسان موقعہ کے باوجود دنیا کی زندگی کو کوئی قابل قدر چیز نہیں بخشتے۔ اور خود بھی وہ کچھ حاصل نہیں کر سکتے جسے بجا طور پر مسرت کہا جا سکے۔ ایسے لوگوں کی افزائش ایک کم قیمت کارنامہ ہو گا۔ اور اگر سوشلزم وہی زندگی اور ذہنیت سب کو عطا کرنی چاہتی ہے۔

جو آج خوشحال طبقہ کے اکثر سرد مہروں کا حصہ ہے۔ تو یہ کچھ ایسی چیز نہیں جو کسی نیک روح میں شوق گدگدا سکے۔

نیقت کہتا ہے ''اجتماعی زندگی کا مقصد حقیقی عالم حاصل کرنا۔ کھوج لگانا اور جاننا ہے کھانا پینا اور سونا---- ایک لفظ میں جینا محض اضافی ہے اس معاملہ میں ہم حیوانوں سے جدا نہیں ہیں۔ ہماری منزل علم ہے۔ اگر مجھے مادی لحاظ سے مسرور کسی کھیت میں بھیڑوں کے ریوڑ کی طرح' پیٹو انسانیت اور دکھوں میں سسکتی انسانیت میں جس میں سے کبھی کبھی ابدی سچائی پھوٹتی رہے۔ ایک کے انتخاب کو کہا جائے۔ تو میری نگاہ انتخاب دوسری پر پڑے۔''

یہ بیان تصویر کے دوسرے رخ کو بہت مبالغہ کے ساتھ پیش کرتا ہے اور کسی حد تک غیر حقیقی بن جاتا ہے۔ جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ جن میں ''ابدی سچائیوں'' کا لطف لینے کی فرصت اور موقعہ ہے ان کے لیے دوسروں پر بیتے دکھوں کے خرچ پر ابدی سچائیوں کی اہمیت بڑھنا بہت آسان ہے تاہم اگر اسے سوال کا جواب دینے کے لیے اختیار کیا جائے۔ تو ترقی کے خیال کی اہمیت ہی جاتی رہتی ہے۔ نسل انسانی کی مجموعی زندگی پر امروز و فردا کے پیش نظر آنکھ ڈالی جائے۔ تو عیاں ہو جاتا ہے کہ جس سوسائٹی میں بعض علم حاصل کرتے اور دوسرے ایڑیاں رگڑتے ہی۔ اس میں انجام کار خوبی کی زیادہ توقع ہے۔ بہ نسبت اس سوسائٹی کے جس میں تمام ایک پژمردہ سی آسائش میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ افلاس بہت بڑی برائی ہی سہی۔ لیکن مادی فراغت بھی بذات خود بڑی خوبی نہیں ہے۔ اسے سوسائٹی کے لیے کار آمد ہونے کی خاطر ان بلند خوبیوں کی ترقی کا ذریعہ بننا ہو گا۔ جو دماغی زندگی سے متعلق ہیں۔ لیکن دماغی زندگی محض تخیل اور علم ہی سے عبارت نہیں اور جماعت کی عام زندگی کے ساتھ اندرونی ربط کے بغیر وہ کہیں گہرائیوں میں کھویا ہوا ہی کیوں نہ ہو' اسے سالم نہیں کہا جا سکتا۔ سماجی جذبہ سے جدا ہو کر تخیل آرٹ کی طرح پر تکلف اور گراں ہو جاتا ہے۔ ہم انسانی خدمت

کے جذبہ میں رنگے ہوئے آرٹ اور تخیل پر غور کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ یہی دماغی زندگی کو جماعت کی زندگی کا مفید عنصر بناتا ہے۔ پھر سوشلزم اس دماغی زندگی کو مدد دے گی یا روکے گی؟ اور کیا جمود اور بے حسی کو روکنے اور عام ترقی کے لیے کافی تحریک باقی رہے گی؟

اس سوال پر غور کرتے ہوئے ہم جمہوریت کی فضا سے کسی حد تک باہر جا رہے ہیں جماعت کی عمومی بہتری صرف افراد میں پائی جاتی ہے اور اس سے بھی زیادہ بعض میں بعض سے بڑھ کر بعض لوگ معاملہ فہم اور دوررس ذہانت رکھتے ہیں جو انہیں بزرگوں کے خیالات کو یاد کرنے اور ان کی قدر کرنے اور نئے میدان معلوم کرنے کے قابل کر دیتی ہے۔ پھر بعض حسن پیدا کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔ ان دیکھے نظاروں کو خلد نظر بناتے ہیں۔ ایسے لوگ جنت سے زیادہ خوش نصیب اور اجتماعی زندگی میں زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ عام مردوں اور عورتوں سے ان کا حصہ رفاہ عامہ میں زیادہ ہوتا ہے۔ وہ لوگوں میں نمایاں رہتے ہیں۔ اور جمہوری مساوات کے چوکھٹے میں ٹھیک نہیں آتے۔ اور جو مجلسی نظام ان کو بانجھ کرتا ہے۔ اپنی تمام خوبیوں کے باوجود قابل نفرین ہے۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے۔ اگرچہ اس کاروباری دور میں یہ ذرا دشوار سا ہے---- کہ دماغی ہنگاموں کی تخلیق کے شاہکار مادی معاوضوں کے کسی نظام میں نہیں پنپ سکتے بلکہ ان کے لیے ایک مضبوط روحانی فضا کی طرف سے تحریک اور موقعہ کی ضرورت ہے جس کے ہوتے ہوئے کسی مالی لالچ کی ضرورت نہیں۔ اور جس کے بغیر مادی معاوضے اکارت ہیں۔ قدردانی خواہ نقدی کی شکل میں ہو۔ بوڑھی عمر میں ایسے سائنس دان کے لیے بہت کچھ مایہ تسکین بن سکتی ہے۔ جس نے ساری عمر ادبی تعصب کے خلاف جہاد کرتے گزار دی ہو یا اس آرٹسٹ کے لیے جس نے سالوں کا تمسخر بزرگوں کے انداز مصوری کو نہ اپنانے کے سبب سہارا ہو۔ لیکن ان کے شاہکار ان مسرتوں کی دورافتادہ امیدوں کے اکسائے ہوئے نہیں ہوتے۔ تمام قابل وقعت

کارنامے ایک بے قیاس جذبہ سے پھوٹتے ہیں اور اس کے بعد بھی انعاموں سے نہیں بلکہ ان حالات سے پروان چڑھتے ہیں۔ جو اس جذبہ کو سلامت رکھتے ہیں اور اس سے پیدا ہونے والے ہنگاموں کے لیے میدان مہیا کرتے ہیں۔ ایسی فضا پیدا کرنے میں ہمارا موجودہ نظام بہت ناکارہ ہے۔ لیکن کیا سوشلزم بہتر ہو گی؟

اس سوال کا جواب اس وقت تک نہیں دیا جا سکتا۔ جب تک یہ فیصلہ نہ ہو جائے کہ کس قسم کی سوشلزم ہمارا مقصود ہے۔ اس کی بعض قسمیں موجودہ سرمایہ داری دور سے بھی زیادہ تباہ کن ہوں گی۔ جب کہ دوسری کئی گنا بہتر۔ دماغی تخلیق کے لیے تین ایسی چیزیں مفید ہیں۔ جنہیں سماجی نظام مہیا کر سکتا یا روک سکتا ہے۔ (i) فنی تعلیم (ii) تخلیقی جذبہ کا ساتھ دینے کی آزادی (iii) لوگوں کی طرف سے کام کی قدردانی۔ ہم اپنی بحث میں سے شخصی ذہانت اور ان غیر محسوس حالتوں کو خارج کر دیتے ہیں۔ جو بعض دوروں کو بند اور بعض کو آرٹ اور سائنس میں بانجھ کر دیتی ہیں۔ لیکن اس لیے نہیں کہ وہ غیر اہم ہیں۔ بلکہ اس لیے کہ انہیں بہت کم سمجھا جاتا ہے۔ اور اقتصادی یا سیاسی جماعت بندی میں ان کا ذکر ضروری نہیں اوپر بیان کی گئی سب حالتیں ان کو لپیٹ میں لے آتی ہیں۔ جنہیں موجودہ نقطہ نظر سے مفید یا مضر کہا جا سکتا ہے اور اس لیے ہم سردست انہیں پر اکتفا کرتے ہیں۔

فنی تعلیم

آج سائنس یا آرٹ میں فنی تعلیم کے لیے دو باتوں میں سے کسی ایک کا ہونا ضروری ہے۔ یا تو لڑکا خوشحال والدین کا بیٹا ہو۔ جو اسے جب تک وہ چاہے تعلیم دے سکیں۔ یا ابتدا ہی میں وہ ایسی قابلیت ظاہر کرے کہ خود کما سکنے کی عمر تک وظیفے پر چل سکے۔ پہلی صورت محض قسمت کی بات ہے اور سوشلزم یا کمیونزم کی کسی شکل کے ماتحت نہیں رہ سکتی۔ موجودہ نظام کے حامی اس نقصان پر بہت زور دیتے ہیں۔ اور اس

میں کوئی شک نہیں کہ کسی حد تک یہ نقصان ہے لیکن آبادی کا بہت کم حصہ خوشحال ہے اور اوسطاً" وہ اپنے سے کم نصیب ہم عصروں سے کسی طرح بھی زیادہ جوہر نہیں رکھتا۔ اگر ان رعائتوں کو جو آج ان میں سے چند کا حصہ ہیں۔ جو سائنس اور آرٹ میں امتیاز حاصل کرنے کے قابل ہیں۔ ذرا اور عام کر دیا جائے تو بہت مفید نتائج حاصل ہو سکتے ہیں اور قابلیت کا زیادہ حصہ جو آج رائیگاں جاتا ہے۔ ٹھکانے لگ جائے لیکن یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟

مقابلہ کے ذریعے وظیفہ حاصل کرنے کا طریقہ نہ ہونے سے اچھا ہی سہی۔ لیکن کئی لحاظ سے قابلِ اعتراض ہے۔ یہ نوخیزوں کے کام میں مقابلہ کی بو پیدا کر دیتا ہے۔ اس سے وہ علم کو دلی رغبت یا اہمیت کی نسبت امتحانی نظر سے دیکھنے لگ جاتے ہیں۔ پھر انعام بھی اس قسم کی قابلیت پر دیا جاتا ہے جو مقررہ سوالات کے چست جوابات میں اچھے انداز سے ظاہر ہوتی ہے۔ نہ کہ اس پر جو مشکلوں میں سوچتی اور وقتی طور پر گونگی رہ جاتی ہے۔ ان سب سے بڑھ کر خرابی نوجوانوں کو زیادہ کام دینے کی طرف رجحان ہے۔ جس سے بلوغت پر پہنچتے پہنچتے ان کی توانائی اور شوق جواب دے چکے ہوتے ہیں۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ آج کتنے عمدہ دماغ اس سے کند ہو چکے ہیں اور ان کی تڑپ مر چکی ہے۔

سٹیٹ سوشلزم شاید مقابلہ کے امتحانوں سے حاصل ہونے والے وظیفوں کو عام کر دے اور اگر ایسا ہی ہے تو ڈر ہے کہ زیادہ مصیبت آئے گی۔ حکومت پرست سوشلسٹ آج اس نظام کے لیے بے تاب نظر آتے ہیں۔ جو اسی انداز کا ہے جو ہر دفتر شاہی ذہنیت والا چاہتا ہے۔ یعنی پرامن' عمدہ' صنعتی کاموں کو حرکت دینے والا۔ جس میں پبلک اخراجات کے حساب اور اس قسم کی کوئی بکواس نہ ہو جسے اعدادوشمار میں درج کیا جا سکے۔ ایسے لوگ کہتے ہیں کہ ساری جماعت کے لیے اعلیٰ تعلیم گراں رہے گی۔ اور اس لیے انہیں کو دینی چاہیے۔ جو غیر معمولی قابلیت کے مالک ہوں اور اسے حاصل

کرنے کے بعد سماج کے مفید رکن بن سکیں۔ ایسی باتیں ان لوگوں کو بہت پسند آتی ہیں جو باعمل بنے پھرتے ہیں۔ اگرچہ ان کے جوابات ایسے ہیں۔ جو زیادہ قائل کرنے والے نہیں بہرکیف موجودہ نظام کے خلاف سوشلسٹوں کی آواز کا بڑا حصہ مقابلہ کی برائیں کے خلاف بغاوت ہے اور اگر کسی اور سبب سے نہیں تو اسی سے سوشلزم کے ہمدردوں کی بہتر حل پیش کرنے کی دعوت دی جا سکتی ہے۔ سب سے زیادہ آسان بات یہ ہے اور یہی زیادہ کارگر بھی ہو سکتی ہے۔ کہ ہر قسم کی تعلیم کو اکیس سال کی عمر تک ان تمام کے لیے جو اسے حاصل کرنا چاہیں۔ مفت کر دی جائے۔ اکثر اس وقت تک تعلیم سے اکتا چکے ہوں گے اور کسی اور کام میں لگنا پسند کریں گے۔ اس طرح کسی کام کی طرف رغبت رکھنے والوں کا قدرتی انتخاب ہو جائے گا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ بھی ہوں گے۔ جو بہت کم قابلیت کے باوجود کسی کام کو کرنا چاہیں گے۔ مثال کے طور پر پینٹر بننے کی آرزو صرف انہیں میں نہیں ہوتی۔ جو نقاشی کر سکتے ہیں لیکن جماعت اس حشو کو آسانی سے گوارا کر سکتی ہے۔ اس کی تعداد آج کے بیکاروں سے بہت کم ہو گی اور جو نظام اس حشو کو بھی دور کرنا چاہتا ہے۔ لازمی طور پر ہر نسل کے بعض اچھے جوہروں کو تباہ و برباد کر دے گا۔ بالکل مفت تعلیم ہی آزادی کے اصولوں سے مطابقت کر سکتی اور قابلیت کو کھل کھیلنے کا موقعہ دے سکتی ہے اور سوشلزم اور انارکزم کے بھی پوری طرح موافق ہے۔ تھیوری کے لحاظ سے یہ سرمایہ دارانہ ہے۔ لیکن عملی طور پر اس سے اس قدر بعید ہے کہ مکمل اقتصادی تجدید کے بغیر یوں ممکن ہی نہیں۔ یہ حقیقت کہ سوشلزم اس تجدید کو آسان کر دے گی۔ انقلاب کی حمایت میں زبردست دلیل ہے۔ کیونکہ آج غریب جماعتوں کے دل و دماغ کی بربادی حیرت انگیز ہے۔

تخلیقی جذبہ کا ساتھ دینے کی آزادی

ٹریننگ ختم کر لینے کے بعد اگر کسی میں واقعی اعلیٰ جوہر ہوں گے۔ اور اسے

آزادی ہو گی کہ اپنے رجحان کے مطابق ماہروں سے بے نیاز ہو کر مفید کام کرے تو اس کا کام بہترین ہو گا۔ آج صرف دو جماعتوں کے لیے ممکن ہے---- جو ذاتی وسائل رکھتے ہیں اور جو کسی ایسے پیشہ سے روٹی کماتے ہیں۔ جس میں ان کی ساری قوت صرف نہیں ہوتی۔ سوشلزم میں کوئی ذاتی وسائل والا نہیں ہو گا اور سائنس اور آرٹ کو نقصان سے بچانے کے لیے ضروری ہو گا۔ کہ جو مواقع آج اتفاق سے چند ایک کو میسر آتے ہیں۔ زیادہ عام کر دیئے جائیں۔ ذاتی وسائل کو تخلیقی کام میں لگانے والے یوں تو چند ایک ہوئے ہیں۔ لیکن بہت اہم ہوئے ہیں---- ملٹن' شیلے' کیٹس اور ڈارون کا نام مثال کے طور پر لیا جا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر انہیں روٹی کمانے کا جنجال بھی ہوتا تو شاید وہ ایسے اچھے کارنامے نہ چھوڑ سکتے۔ ڈارون یونیورسٹی ٹیچر ہوتا تو پادریوں کا رسوخ اس کے باغی خیالات کے سبب اسے ملازمت سے برطرف کرا دیتا۔

بہرحال دنیا کے تخلیقی کام کا زیادہ حصہ آج ان لوگوں کا مرہون ہے جو کسی اور پیشہ پر گزارہ کرتے ہیں۔ سائنس اور ریسرچ کو استاد پیشہ عموماً" فرصت کے لمحوں میں کرتے ہیں۔ سائنس کے معاملہ میں یہ قابل اعتراض نہیں۔ اگر پڑھانے کے اوقات زیادہ نہ ہوں۔ کیونکہ سائنس اور تعلیم ایسے گھلے ملے ہیں کہ آج سائنس کا رنگ غالب ہے۔ موسیقی میں یہ رعایت اسے حاصل ہے۔ جو خود ہی گیت بناتا اور خود ہی ادا کرتا ہے۔ لیکن جو ادا نہیں کر سکتا اس کا بھوکوں مرنا یقینی ہے۔ اگر وہ مالدار نہیں اور مذاق عامہ کے آگے جھکنے کو بھی تیار نہیں۔ موجودہ دور میں یہ ممکن نہیں کہ فنون لطیفہ میں حقیقی معنوں میں اچھے کام سے روٹی کمائی جا سکے۔ یا کوئی ایسا امدادی شعبہ مل جائے جو تخلیق کے لیے کافی فراغت دے سکے اور دیگر کئی وجوہات کے ساتھ سائنس کی نسبت آرٹ کے کم پھولنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

دفتر شاہی اور حکومت پرست سوشلسٹ اس کا آسان حل بنا دے گا۔ وہ آرٹ یا سائنس کے چیدہ چیدہ لوگوں کی ایک انجمن تجویز کر دے گا جو نوجوانوں کے کام کا اندازہ

لگا کر ان کو لائسنس دے دیا کریں۔ جن کی تصانیف انہیں پسند آئیں۔ اور آرٹ پیدا کرنا ہی لائسنس دار آرٹسٹ کی جماعتی خدمت سمجھا جائے گا البتہ کام کے ذریعے اسے اپنی سرگرمی کا اور مصنفوں کی رضا جوئی سے اپنی قابلیت کا ثبوت دینا ہوگا۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ خود ناقد بن جائے۔ اس طرح ذمہ دار افسر یقین چاہیں گے کہ آرٹسٹ لائق اور اپنے فن کی بہترین روایات پر چلنے والا ہو۔ جو یہ شرائط پوری نہ کر سکیں گے۔ لائسنس کی ضبطی کے ذریعے روٹی کمانے کا کوئی اور طریقہ سوچنے پر مجبور کیے جائیں گے ---- یقیناً سٹیٹ سوشلسٹ کا نظریہ کچھ اسی قسم کا ہوگا۔

لیکن اس قسم کی دنیا میں جو چیز حسن کے پرستار کے لیے زندگی کو گوارا بناتی ہے فنا ہو جائے گی۔ آرٹ فطرت انسانی کے سرکش اور نراجک پہلو سے ابلتا ہے۔ آرٹسٹ اور دفتر شاہی انسان میں ہمیشہ ایک بیگانگی کا پردہ رہنا ضروری ہے۔ زندگی بھر کی لڑائی جس میں آرٹسٹ ہمیشہ ظاہری طور پر پامال لیکن انجام کار جیت جاتا ہے۔ لوگ اس آرام کے لیے اس کے ممنون ہوتے ہیں جس سے وہ ان کی زندگیوں کو شاداب کرتا ہے۔ اگر فطرت انسانی کے اس سرکش پہلو کو ہمیشہ کے لیے نیک اندیش لیکن ضدی دفتر شاہی انسان کے آئین پسند قواعد کے تحت کر دیا جائے تو زندگی کی مسرت دنیا سے ناپید اور جینے کی تمنا آہستہ آہستہ مرجھا کر پتی پتی ہو جائے۔ کائنات کی ایسی لاش سے موجودہ دور اپنی ساری ہیبت ناکیوں کے باوجود ہزار گنا بہتر ہے۔ ایسی سٹیٹ سوشلزم سے جو غزالوں کو بیڑیاں ڈالتی ہو۔ انارکزم کے سب خطرات قبول۔ یہی بھیانک خواب آرٹسٹوں اور حسن کے پرستاروں کو اکثر سوشلزم سے بدظن کر دیتا ہے۔ لیکن سوشلزم کے مزاج میں کوئی چیز آرٹ کو غیر ممکن کر دینے والی نہیں۔ البتہ اس کی بعض خاص خاص شکلیں اس خطرے کو لانے والی ہیں۔ ولیم مورس ایک سوشلسٹ تھا اور بہت حد تک اسی لیے سوشلسٹ تھا کہ وہ آرٹسٹ تھا اور اس میں وہ غلط نہیں تھا۔

آرٹ کسی ایسے نظام میں پنپ نہیں سکتا جو کہتا ہے کہ آرٹسٹ کے لیے افسروں

کی کسی جماعت کے سامنے اپنی قابلیت ظاہر کرنا ضروری ہے۔ اور حقیقت میں اعلیٰ آرٹسٹ کا ان بزرگوں کی نظر میں ناکارہ دکھائی دینا بہت یقینی ہے۔ جنہیں ہڑتال کے لیے مقرر کیا جائے گا۔ بزرگوں کو پسند آنے والی چیزیں پیش کرنے کا خیال ہی جذبہ آزاد اور بے لوث اختراع کے خلاف ہے۔ اس مشکل کے علاوہ حسد' سازش اور غیبت پیدا ہو کر درپردہ مقابلہ کی زہریلی فضا قائم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ایسی تجویز کا واحد اثر ان چند لوگوں کو ذات باہر کرنا ہو گا جو آج حسن اتفاق سے کامیاب ہو جاتے ہیں---- آرٹ قیدوبند میں نہیں آزاد فضا میں سانس لے سکتا ہے۔

دو طریقے ایسے ہیں جن کے ذریعے آرٹسٹ حقیقی سوشلزم میں بھی آزاد رہ سکتا ہے---- وہ نسبتاً کم تنخواہ لے کر دن کے کچھ گھنٹے کوئی اور کام کرے اس صورت میں اسے اپنی تصویریں بیچنے کا اختیار ہونا چاہیے۔ اس سے کئی فوائد حاصل ہوں گے۔ ہر ایک آدمی آرٹسٹ بننے کے لیے آزاد ہوگا۔ بشرطیکہ وہ کچھ اقتصادی نقصان برداشت کرنا گوارا کرے۔ یہ طریقہ ان کی حوصلہ شکنی نہیں کرے گا۔ جن میں یہ جذبہ قومی اور خالص ہو گا۔ البتہ فریب خوروں کو نکال باہر کرے گا۔ آج کئی نوجوان آرٹسٹ از خود اس سے زیادہ غربت جھیلتے ہیں۔ جس قدر ایک سدھری ہوئی سوشلسٹ برادری میں آدھا وقت کام کرنے سے آ سکتی ہے اور کچھ نہ کچھ تکلیف قابل اعتراض نہیں۔ اس سے تخلیقی جذبہ کی قوت کا امتحان ہو جائے گا اور تخلیقی زندگی کی مخصوص مسرتوں کو نیا میدان مل جائے گا۔

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ضروریات زندگی مفت ہوں۔ جیسا کہ انارکسٹ چاہتے ہیں کسی کو کام پر مجبور نہ کیا جائے۔ ایک قسم کا وظیفہ مقرر ہو۔ جو عیش و عشرت کے لیے نہیں البتہ زندہ رہنے کے لیے کافی ہو۔ جو آرٹسٹ اپنا سارا وقت آرٹ اور تفریح میں گزارنا پسند کرے وہ وظیفہ پر گزارہ کر سکتا ہے---- اگر اسے دوسرے ممالک کے دیکھنے کا جنون ہو تو وہ پیدل دھوپ اور ہوا کا لطف اٹھاتا پرندوں کی طرح

آزاد اور خوش جا سکتا ہے۔ ایسے لوگ جماعت کی زندگی میں رنگ اور بوقلمونی لائیں گے۔ ان کے خیالات قفس میں بند مزدوروں سے جدا ہوں گے اور خوش طبعی کا نہایت ضروری عنصر زندہ رکھیں گے۔ جسے ہماری متین اور پرہیز گار تہذیب فنا کر دینا چاہتی ہے۔ اگر وہ لوگ بہت زیادہ ہو جائیں تو معاشی لحاظ سے کام کرنے والوں پر بوجھ ہو سکتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ نسبتاً ہلکے اور خوشگوار کام کو چھوڑ کر جیسا کہ ان دنوں عام ہو گا کم لوگ افلاس اور آزادی کو انتخاب کریں گے۔

اب کسی طریقے سے سوشلسٹ جمہوریت میں بھی آرٹسٹ کی آزادی برقرار رہ سکتی ہے اور اس سے کہیں زیادہ جو آج سرمایہ داروں کو چھوڑ رک دوسروں کو میسر ہے۔

لیکن ابھی کئی اور کم آسان سوال رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر کتابوں کی اشاعت سوشلزم کے ماتحت آج کی طرح ناشر نہیں ہوں گے۔ سٹیٹ سوشلزم میں حکومت واحد پبلشر ہو گی۔ یہی کیفیت سنڈیکلزم یا گلڈ سوشلزم کی ہو گی۔ ان حالات میں کون فیصلہ دے گا کہ فلاں کتاب چھپنی چاہیے۔ اگر حکومت واحد پبلشر ہو گی تو یقینی طور پر ان کتابوں کو رد کر دے گی۔ جو سٹیٹ سوشلزم کے خلاف ہوں گی یہی حال گلڈ سوشلزم اور سنڈیکلزم کا ہے اور ان سیاسی تکلیفوں کے علاوہ لٹریچر کے لیے بھی جانچ پڑتال کا ایک محکمہ ہوگا۔ جسے ہم فنون لطیفہ کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے تیار کر چکے ہیں۔ مصیبت ضرور کڑی ہے۔ لیکن اگر لٹریچر کو آزاد رکھنا ہے تو اس کا مداوا سوچنا نہایت ضروری ہے۔

کروپاٹکن جس کا خیال دماغی اور جسمانی کام کو اکٹھا کر دینے کا ہے کہتا ہے کہ مصنف کو خود کوزہ گر خود گل کوزہ ہونا چاہیے اور کتابوں کی اشاعت میں سارا دستی کام اسے خود کرنا چاہیے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ دنیا میں اس قدر مصنف ہوں کہ سارا کام چل سکے اور یوں بھی میرے خیال میں تو یہ محض وقت کو ضائع کرنا ہے۔ جب

دوسرے لوگ اس کام کو اچھا اور جلدی انجام دے سکیں لیکن اس کا ہمارے موجودہ سوال سے (کہ کتابیں اشاعت کے لیے کیونکہ چنی جائیں گی) کوئی تعلق نہیں۔ کروپا ٹکن کے خیال میں تو ایک دارالمصنفین ہو گا۔ جس کی ایک انتظامیہ کمیٹی ہو گی۔ یہ کمیٹی فیصلہ کرے گی کہ کون کون سی کتابیں شائع ہونے کے قابل ہیں۔ ان میں لازمی طور پر ان کی اپنی اور ان کے دوستوں کی کتابیں ہوں گی۔ اور کسی صورت میں بھی مخالفوں کی نہیں۔ ادھر رازے ہوئے نسخوں کے مصنف کبھی کامیاب حریفوں کی کتابوں کی تالیف میں اپنا وقت ضائع کرنا گوارا نہ کریں گے اور کتابوں کی اشاعت کے لیے باہمی امداد کے کسی مفصل نظام کی ضرورت ہو گی۔ ورنہ ممکن نہیں کہ ادیبوں میں ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔ یا کسی اجتہادی انداز کی کتاب شائع ہو سکے۔ خود کروپا ٹکن کی کتابیں دھری رہ جائیں۔

البتہ یوں ہو سکتا ہے کہ اگر حکومت اسے چھاپنے پر تیار نہ ہو تو مصنف کو اپنے خرچ پر اپنی کتاب شائع کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ طریق سوشلزم کی روح کے خلاف ہے۔ لیکن مجھے اور کوئی چارہ بھی نظر نہیں آتا۔ خرچ کے متعلق یوں ہو سکتا ہے۔ کہ مصنف سے کسی مفید شعبے میں ایک میعاد تک کام لیا جائے اور جس قدر مناسب ہو کمائی کا حصہ دے دیا جائے۔ اگرچہ اس طرح کام کرنے کو بھی بعض جیسا کہ کروپا ٹکن کہتا ہے۔ اشاعت کتب کا دستی حصہ کہیں گے۔ لیکن میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ یہ قانون بنا دیا جائے گا کہ کوئی کتاب کسی قسم کی ہو رد نہ کی جائے۔ اگر اس کی اشاعت کی اجرت میعاد مقرر پر دے دی گئی ہو۔ اس طرح جس مصنف کے پسند کرنے والے موجود ہوں گے اسے ادائیگی خرچ میں ان سے مدد مل جائے گی۔ البتہ یہ سچ ہے کہ غیر معروف مصنف کو کافی نقصان اٹھانا پڑے گا۔ لیکن "آمد اور "آورد" میں پہچان بھی ہو جائے گی۔ اس لیے اسے ہم برا نہیں کہہ سکتے۔

موسیقی کے متعلق بھی کچھ ایسے ہی طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔

پکے سوشلسٹ ضرور اس پر جزبز ہوں گے۔ کیونکہ انہیں اس میں سے نجی اجرت کی بو آئے گی۔ لیکن کسی نظام کا غلام ہو جانا سخت غلطی ہے۔ اور ہر نظام اگر اسے ہوبہو عمل میں لایا جائے تو ایسے نقائص پیدا کر دیتا ہے۔ جو بعض کو مراعات دینے سے ہی دور ہو سکتے ہیں۔ مجموعی طور پر سوشلزم کی کوئی اچھی سی شکل سرمایہ داری نظام سے زیادہ آرٹسٹ اور اہل علم کو ابھرنے کا موقعہ دے سکتی ہے۔ لیکن وہ ایسی سوشلزم ہونی چاہیے جو مذکورہ مقاصد کے حسب حال ہو۔

قدردانی کا امکان

یہ شرط ہر تخلیقی کام کرنے والے کے لیے ضروری نہیں۔ لیکن جن معنوں میں میں لے رہا ہوں۔ اکثریت اسے لازمی سمجھتی ہے میرا مطلب نہ دور تک پھیلی ہوئی شہرت سے ہے اور نہ تحسین ناشناس ان دونوں حالتوں سے یہاں بحث نہیں۔ میرا مطلب اس بے ساختہ احساس اور فراست سے ہے کہ حسن بڑی چیز ہے۔ نرمی بینوں کی سماج میں آرٹسٹ کی قدر اس کی پیدا کردہ دولت سے ہوتی ہے اور اس کے فن کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ ایک لکھ پتی کو جس نے دولت کے انبار لگا لیے ہوں رعب دار سمجھا جاتا ہے لیکن ان چیزوں کی نسبت کوئی ایسا خیال دل میں نہیں لایا جاتا۔ جن سے اس نے دولت سمیٹی ہے۔ جس سماج میں ہر چیز دولت سے پالی جاتی ہو۔ یہی حال آرٹسٹ کا ہے۔ اگر وہ مالدار ہے تو اس کی عزت ہے اگرچہ سیٹھ صاحب جتنی نہیں۔ لیکن اس کی تصویروں یا کتابوں کو دولت کا ذریعہ ہی سمجھا جائے گا۔ ایسی فضا میں آرٹسٹ کے لیے اپنے تخلیقی جذبہ کو پاک رکھنا دشوار ہو جاتا ہے یا تو وہ ماحول کی آسائشوں کو قبول کر لیتا ہے یا اپنے کارناموں کی پوری داد نہ ملنے سے دل برداشتہ ہو جاتا ہے۔

آرٹسٹ سے بڑھ کر اس کے آرٹ کی قدر ضروری ہے۔ ایسے ماحول میں جہاں ہر

چیز افادی حیثیت سے دیکھی جاتی ہو۔ آرٹسٹ کا زندہ رہنا مشکل ہے زندگی کی جس فضا میں آرٹ کا پھول کھلتا ہے۔ اس کے لیے بے غرضی---- کل کے دھندوں کی الجھن سے پاک ہو کر لطف لینے کی ضرورت ہے۔ جینے کے لیے جدوجہد تجارت یا کسی شعبے میں جانسوز کام لوگوں کو مذاق اور آرٹ کے قابل نہیں چھوڑتے۔ اس دوڑ دھوپ میں سہولت کام کے اوقات میں کمی۔ زندگی کے بوجھ کو ہلکا کر دینا جو کسی اچھے معاشی نظام میں ممکن ہے زندگی کی مسرت اور دنیا کی خوشیوں میں حصہ لینے کی قوت کو بڑھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر یوں ہو جائے تو حسین چیزوں میں بے ساختہ مسرت اور آرٹسٹوں کے کام میں زیادہ لطف آ سکتا ہے۔ لیکن نرے افلاس کو دور کر دینے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے آزادی کی وسعت اور دباؤ کے اس احساس کا نہ رہنا ضروری ہے۔ جو آج شخصی روح کی گردن توڑ رہا ہے۔ سٹیٹ سوشلزم میں یہ ممکن نہیں۔ البتہ سوشلزم کی کوئی اور شکل جس نے انارکی تعلیم کی صداقتوں کو بھی اپنا لیا ہو۔ وہاں نلے جا سکتی ہے۔ جہاں سرمایہ داری کے پر جلتے ہیں۔

ترقی اور کمال کا احساس تخلیقی کام کے لیے بہت زبردست محرک ہو سکتا ہے اس لیے بہت کچھ انحصار اس سوال پر ہے۔ کہ آیا صنعت اور کاشت میں ذرائع پیداوار جامد ہو جائیں گے۔ یا گذشتہ سو سال کی طرح سرعت سے تبدیل ہوتے رہیں گے یہ تو ہو سکتا ہے کہ پیداوار کے ترقی یافتہ طریقے آج سے کہیں زیادہ جماعت کے لیے مفید ہوں لیکن شاید اس وقت فنی ترقی کی طرف لوگوں کی توجہ اس قدر نہ رہے جس قدر آج ہے۔ مزدوروں کی طبعی رجعت پسندی کو زیادہ طاقت پکڑنے سے باز رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ جو کوئی اچھے ذرائع ایجاد کرے۔ اسے ایک مدت تک اس کے نفع کا کم سے کم حصہ دیا جایا کرے۔ اس طرح ہر گلڈ اختراع کی دھن میں لگا رہے گا۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ اصلاح و ترقی کا مقصد زیادہ فراغت بہم پہنچانا ہوگا یا اجناس کے حصوں کی مقدار زیادہ کرنا۔ جہاں کہیں فراغت زیادہ ہو گی۔ وہاں زیادہ لوگ سائنس اور

آرٹ کو جاننے والے ہوں گے۔ آرٹ یا سائنس میں کھوج لگانے والا آج سے بہت کم عام شہریوں سے بچھڑا ہوا اور بیگانہ ہوگا اور اس سے اس کی تخلیقی قوت کو تحریک ملتی رہے گی۔

میرے خیال میں ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں کہ آرٹ اور سائنس کی تینوں ضرورتوں ـــــ ٹریننگ' آزادی' قدردانی ـــــ کے پیش نظر سٹیٹ سوشلزم موجودہ خامیوں کو دور کرنے میں بری طرح ناکام رہے گی۔ بلکہ نئی خرابیاں پیدا کرے گی۔ لیکن گلڈ سوشلزم یا سنڈیکلزم اگر ان لوگوں کی طرف فراخدلانہ پالیسی اختیار کریں۔ جو کسی شعبے میں مقررہ وقت سے کام کرنے کو ترجیح دیں۔ تو سرمایہ داری نظام سے کئی گنا بہتر ہیں۔ اس میں خطرے ہیں۔ لیکن وہ چھٹ جائیں گے۔ صرف آزادی کی اہمیت جاننے کی ضروری ہے۔ اس معاملہ میں بھی اور دوسری باتوں کی طرح جنت کی راہ آزادی کی راہ ہے۔

آٹھواں باب

کیا سے کیا ہو سکتا ہے

اکثر مردوں اور عورتوں کی زندگی میں امید سے کہیں زیادہ خوف کو دخل ہے---- انہیں ان چیزوں کا زیادہ خیال ہے جو شاید دوسرے ان سے لے لیں بہ نسبت اس مسرت کے جسے وہ شاید اپنی اور ان لوگوں کی زندگی میں پیدا کر سکیں جو ان سے رسم و راہ رکھتے ہیں۔

یہ زندگی کی شان نہیں ہے۔

جن کا جینا اپنی ذات کے لیے۔ دوستوں کے لیے اور دنیا کے لیے مفید ہے امید اور مسرت کی سرخی ان کے چہروں پر مسکرا رہی ہے---- ان کے سامنے چمکتا ہوا مستقبل ہے اور یہ شاداب احساس کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ اپنے نجی تعلقات میں انہیں یہ خیال نہیں کھائے جاتا کہ لوگ کہیں ان کی عقیدت اور ان کا احترام نہ چھوڑ دیں۔ وہ آزادانہ محبت اور احترام کرنے میں مصروف ہیں اور اس کا انعام انہیں خود بخود مل رہا ہے۔ اپنے کام میں انہیں مقابلہ کرنے والوں کا خوف نہیں ستاتا۔ سیاست میں وہ اپنی جماعت کے ناجائز حقوق کی حفاظت میں وقت ضائع نہیں کرتے۔ بلکہ مجموعی طور پر ساری دنیا کو زیادہ شاداب کم بھیانک حرص کی ستم رانیوں کا کم شکار اور ان انسانوں سے معمور دیکھنا چاہتے ہیں جنہیں دباؤ نے پامال اور پست نہیں کر دیا۔

اس انداز کی زندگی میں ایک بنیادی خوشی ہے۔ جسے خزاں کی ہوا مرجھا نہیں سکتی۔ مقدس کتابوں میں اسی پر زور دیا گیا ہے۔ جنہوں نے اسے پا لیا ہے وہ خوف کے بھوت سے نجات پا گئے کیونکہ جس کو وہ گراں بہا سمجھتے ہیں۔ وہ کسی بیرونی طاقت کے رحم پر موقوف نہیں ہے۔ اگر تمام انسان رکاوٹوں اور مایوسیوں کے باوجود اس ادا سے

جینے کے لیے قلب و نظر پیدا کریں تو سیاسی اور معاشی اصلاح کے ذریعہ نئی دنیا بسانے کی ضرورت ہی نہ رہے۔ لوگوں کی اخلاقی تجدید سب دکھوں کا علاج بن جائے۔ مسیح کی تعلیمات کو برائے نام مانتے صدیاں ہو چکیں اور ابھی ان پر عمل کرنے والوں کو اسی طرح کو سا جا رہا ہے۔ تجربہ نے ظاہر کر دیا ہے کہ کسی باہر کی زندگی کی کھلی خرابیوں میں سے اندرونی مسرت کو تاڑنے والے بہت کم ہیں۔ جو ایمان اور تخلیقی امید سے حاصل ہوتی ہے۔ خوف کے بھوت سے چھٹکارا پانے کے لیے لوگوں کو تقدیر پر شاکر رہنے کی تلقین ہی کافی نہیں ہے خوف کے اسباب کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔ اچھی زندگی کو دنیاوی لحاظ سے ناکام نہ رہنے دینے اور ان نقصانات کو کم کرنے کی ضرورت ہے۔ جو ذاتی حفاظت نہ کر سکنے والوں کو دبوچ سکتے ہیں۔

موجودہ زندگی میں تین قسم کی برائیاں نظر آتی ہیں۔ پہلی وہ جن کا سبب نیچر یا قدرت ہے---- ان میں موت' دکھ اور غم معاش شامل کیے جا سکتے ہیں انہیں ہم طبعی برائیاں کہیں گے۔ دوسری وہ جو کردار و خیالات میں نقائص سے پھوٹتی ہیں---- مثلاً جہالت' قوت ارادی کی کمی اور پر تشدد جذبات انہیں ہم کرداری برائیاں کہیں گے۔ تیسری وہ ہیں جو ایک شخص یا گروہ کے دوسرے شخص یا گروہ پر اقتدار سے پیدا ہوتی ہیں---- ان میں کھلم کھلے ظلم کی وارداتیں ہی نہیں۔ بلکہ آزاد بالیدگی کی راہ میں ہر مداخلت شامل ہے۔ خواہ وہ قوت سے ہو۔ یا زیادہ دماغی اثر سے جیسا کہ تعلیم سے ہو سکتا ہے۔ انہیں ہم قوت کی برائیاں کہیں گے۔ ان تینوں برائیوں کو سامنے رکھ کر کسی مجلسی نظام کو جانچا جا سکتا ہے۔

تینوں میں امتیاز آسان نہیں۔ خالص طبعی برائی وہ حد ہے۔ جہاں ہم کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ ہم کبھی موت کو ختم نہیں کر سکتے۔ البتہ سائنس اسے وقتی طور پر ٹال سکتی ہے۔ اور یہ ممکن ہے کہ کسی وقت اکثریت دیر تک زندہ رہنے لگے۔ دکھ سے بالکل رہائی نہیں ہو سکتی۔ البتہ اسے بہت حد تک گھٹایا جا سکتا ہے۔ بغیر محنت کے زمین اپنے خزانے نہیں اگلتی۔ ہم صرف محنت کی مقدار کم کر سکتے ہیں۔ اور اسے اس سطح پر لا سکتے ہیں کہ وہ برائی نہ رہے۔ کرداری برائیاں عموماً" بیماریوں کی شکل میں طبعی برائیوں

کا نتیجہ ہوتی ہیں- اور اس سے بھی زیادہ قوت کی برائیوں کا- کیونکہ ظلم عامل و معمول دونوں کو گرا دیتا ہے- قوت کی برائیاں ان میں جو قوت رکھتے ہیں- کرداری برائیوں اور طبعی برائیوں کے خوف سے جسے بے آسروں کی تقدیر بننا ہوتا ہے- مزید تیز ہو جاتی ہیں- غرض تینوں برائیاں ایک دوسرے میں گھلی ملی ہیں تاہم ذرا کھلے معنوں میں ہم اپنی محرومیوں میں سے پہچان سکتے ہیں کہ نیچر کردار یہ دوسروں کی غلامی نے کن کن کو جنم دیا ہے-

ان تینوں سے نپٹنے کے لیے ذریعے یہ ہیں---- طبعی برائیوں کے لیے سائنس کرداری کے لیے تعلیم (اپنے وسیع معنوں میں) اور ان سب جذبات کی آزادی جو تسلط کی بو نہیں دیتے- قوت کی برائیوں کے لیے سماج کی سیاسی اور معاشی تنظیم میں ایسی اصلاح کہ ایک شخص کا دوسرے کی زندگی میں دخل دینے کا امکان بہت کم ہو جائے- سب سے پہلے ہم تیسری قسم کو لیتے ہیں- کیونکہ سوشلزم اور انارکزم نے قوت کی برائیوں کو دور کرنے کی سعی کی ہے- دولت کی ناہمواریوں کے خلاف آواز کا باعث برائیوں کا احساس ہے جو دولت کی سونپی ہوئی قوت سے اٹھتی ہیں- کول نے اس بات کو نہایت خوبی سے پیش کیا ہے : "میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں- کہ ہماری موجودہ سوسائٹی میں وہ کونسی بنیادی برائی ہے جسے دور کرنے کے لیے ہمیں اٹھنا چاہیے؟ اس سوال کے دو ہی جواب ممکن ہیں اور مجھے یقین ہے کہ بہت سے نیک خیال لوگ غلط ہی کہیں گے وہ کہیں گے افلاس جہاں انہیں غلامی کہنا چاہیے دولت اور ادبار بڑے بڑے حصے اور چھوٹی چھوٹی اجرتیں---- آئے دن ان شرمناک تفاوتوں کو دیکھتے اور خیرات وغیرہ کے ذریعے توازن قائم رکھنے کی بنجر کوششوں کے تلخ احساس کے باوجود وہ بلا تامل کہہ دیں گے کہ وہ افلاس کے مٹانے پر تلے ہوئے ہیں- اس بات میں ہر سوشلسٹ ان کے ساتھ ہے لیکن انہوں نے میرے سوال کا جواب بالکل غلط دیا ہے- کیونکہ افلاس تو محض نشانی ہے- حقیقی مرض غلامی ہے- دولت اور ادبار کی دونوں انتہائیں حکم و اطاعت کی انتہاؤں کا نقش قدم ہیں- غلام اس لیے نہیں بنائے جاتے کہ وہ غریب ہیں بلکہ وہ غریب اس لیے ہیں کہ غلام ہیں- لیکن سوشلسٹ اکثر غریب کی مادی پستی پر

آنکھ ڈالتے ہیں۔ اس سے ناواقف کہ یہ تو غلام کے روحانی زوال کا کرشمہ ہے میرے خیال میں کوئی سمجھدار انسان انکار نہیں کر سکتا کہ موجودہ نظام میں قوت کی برائیاں ضرورت سے بہت زیادہ ہیں اور سوشلزم کی کسی مناسب شکل میں بہت کچھ گھٹ سکتی ہیں۔ آج چند خوش نصیب لوگ کرایہ یا سود پر فراغت سے رہنے کے قابل ہیں، اور انہیں کسی اور نظام میں ایسی آزادی بمشکل ہاتھ آ سکتی ہے۔ لیکن کروڑوں انسان۔۔۔۔ بہت غریب ہی نہیں بلکہ مزدوروں کے تمام طبقے اور پیشہ ور جماعتیں روپیہ حاصل کرنے کی ہوس کا شکار ہیں۔ انہیں اتنی محنت کرنا پڑتی ہے کہ کولہو کے چکر سے باہر سانس لینے کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔ ادھیڑ عمر میں جو ریٹائر ہو جاتے ہیں۔ چند دنوں میں اکتا جاتے ہیں۔ کیونکہ انہیں خبر ہی نہیں ہوتی کہ فرصت کے اوقات کیونکر بسر کیے جاتے ہیں۔ اپنے کام سے باہر کی تمام دلچسپیاں گھٹ کر مر چکی ہوتی ہیں۔ لیکن یہ تو پھر بھی اچھے بھاگوں والے ہیں۔ دوسروں کو بڑھاپے تک سخت محنت کرنی پڑتی ہے۔ بھوک کا بھیڑیا ہر وقت منہ کھولے سامنے ہوتا ہے۔ دولت والوں کو یہ فکر ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو مناسب تعلیم یا طبی امداد نہ دے سکیں گے اور غریب تو خیر ہیں ہی فاقوں کے لیے۔ اس پر ستم یہ کہ کام کرنے والوں کا کام میں کوئی دخل نہیں۔ سارا دن وہ مشین بنے کارخانہ دار کے حکم بجا لاتے رہتے ہیں۔ ایسی ناگوار صورتوں میں کام کیوں کر دکھ دینے والا اور مصیبت خیال نہ کیا جائے کام کی واحد محرم اجرت ہے اور اس خیال کو ہی جنا کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے کہ کام خوشگوار ہے۔

ان برائیوں کا بہت سا حصہ قطعاً" غیر ضروری ہے۔ اگر مہذب دنیا کو دوسرے کے دکھ کی جگہ صرف اپنی خوشی چاہنے پر آمادہ کر لیا جائے۔ اگر انہیں دوسری جماعتوں یا قوموں کے سبقت لے جانے کے ڈر سے تخریبی کاموں میں لگنے کی نسبت تعمیری طور پر ان اصلاحوں کے لیے تیار کیا جا سکے جن سے وہ باقی دنیا کے ساتھ بہرہ مند ہوں گے تو دنیا کا سارا نظام سر سے پاؤں تک دنوں میں سدھر جائے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ آزادی کے نقطہ نظر سے کون سا نظام بہتر ہوگا اور ہماری رفتار کا دھارا کس سمت بہنا چاہیے۔

سروست باقی سب باتوں کو نظر انداز کر کے مجھے یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ بہتر نظام کروپا ٹکن کے بتائے گئے نظریہ کے لگ بھگ ہی ہو سکتا ہے۔ جسے گلڈ سوشلزم کے بڑے بڑے اصولوں کو اپنا کر زیادہ کار آمد بنا لیا گیا ہو۔ چونکہ ہر بات پر اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے بغیر دلیل بازی کے کام کی تنظیم کی وہ طرز پیش کرتا ہوں جو بہت بھلی لگے گی۔

تعلیم سولہ سال یا زیادہ کے لیے لازمی ہونی چاہیے۔ اس کے بعد اسے جاری رکھنا یا نہ رکھنا شاگرد کے اختیار پر ہونا چاہیے لیکن اکیس سال تک ان کے لیے جو حاصل کرنا چاہیں۔ مفت ہونی چاہیے۔ اس کے بعد کسی کو کام کے لیے مجبور نہیں کرنا چاہیے اور جو بیکار رہنا پسند کریں۔ انہیں محض روزینہ ملنا چاہیے۔ اور بالکل آزاد چھوڑ دینا چاہیے۔ لیکن لوگوں کی ذہنیت ایسی کر دینی چاہیے کہ انہیں کام سے محبت ہو تاکہ نسبتاً کم لوگ بیکاری قبول کریں مالی لحاظ سے بیکاری کو ممکن کر دینے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہو گا کہ کام ناگوار نہیں رہے گا۔ کوئی جماعت معاشی الجھنوں کو حل کر لینے کا دعوی نہیں کر سکتی۔ جب تک اس کا بہت سا کام ناگوار ہے میرے خیال میں یہ مان لینا بعید از عقل نہیں کہ اس وقت بہت کم لوگ بیکار رہنا پسند کریں گے۔ جب کہ آج نوے فیصدی ایسے لوگ جن کی سالانہ آمدنی ایک سو پونڈ ہے۔ یا اجرت کام کے ذریعے آمدنی بڑھانے کے لیے بے تاب ہوتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ سائنس کی مدد سے سارا سماج دن میں چار گھنٹے کام کرنے سے باآرام زندگی بسر کر سکتا ہے۔ جبکہ اندرونی اور بین الاقوامی مقابلہ میں لگنے والے غیر مفید کام کی بہت بڑی مقدار بھی نہ رہے گی۔ تجربہ کار خانہ دار آج بھی کہتے ہیں کہ ان کے ملازم چھ گھنٹوں میں اسی قدر کام کر سکتے ہیں۔ جس قدر آٹھ گھنٹوں میں کرتے ہیں۔ فنی لحاظ سے آج سے زیادہ بڑھی ہوئی دنیا میں یہی کیفیت ہو گی لوگوں کو آج کی طرح ایک کام یا اس کا چھوٹا سا حصہ ہی نہیں سکھلایا جائے گا۔ بلکہ مختلف شعبوں سے آگاہی دی جائے گی۔ تاکہ وہ موسموں اور مانگ کے الٹ پھیر کے مطابق اپنے پیشے تبدیل کر سکیں۔ ہر صنعت اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہو گی بلکہ ہر فیکٹری خود

ان باتوں کا فیصلہ کیا کرے گی۔ جن کا اس کے مزدوروں سے تعلق ہو گا۔ وہاں سرمایہ داری نظم و نسق نہیں ہو گا۔ بلکہ سیاست کی طرح انتخاب کردہ نمائندوں کے ہاتھ میں باگ ڈور ہو گی۔ پیدا کرنے والوں کے مختلف گروہوں کے تعلقات گلڈ کانگرس قائم کرے گی۔ کسی جماعت کے سکناتی حیثیت سے معاملات کا فیصلہ پارلیمنٹ کیا کرے گی۔ پارلیمنٹ اور گلڈ کانگرس کے باہمی جھگڑوں کا علاج ایک ایسی انجمن کے ہاتھ ہو گا۔ جو دونوں کے نمائندوں سے مرکب ہو گی۔

تنخواہ آج کی طرح کیے گئے کام کے لیے نہیں۔ بلکہ کام کے لیے آمادی پر ملا کرے گی۔ زیادہ آمدنی والے کاموں میں آج بھی یہی دستور ہے۔ ایک شخص کسی جگہ کام کرتا ہے اور وہ اس وقت بھی بحال رہتا ہے۔ جب کوئی کام نہیں ہوتا بیکاری اور روزی کھو جانے کا بھوت اس کا سکون نہیں لوٹے گا۔ پھر ہر آمادہ کار کو برابر برابر تنخواہ ملے گی۔ یا غیر معمولی ذہانت و مہارت والے غیر معمولی تنخواہ پائیں گے یہ معاملہ ایسا ہے جس کا فیصلہ ہر گلڈ پر چھوڑ دینا چاہیے ایک تھیٹر میں گانے والا جسے پردہ اٹھانے والے سے زیادہ تنخواہ نہ ملے۔ نظام کے تبدیل ہو جانے تک ممکن ہے۔ پردہ بر انداز رہنا پسند کرے۔ اس صورت میں زیادہ تنخواہ ضروری سمجھی جائے گی۔ لیکن اگر گلڈ اس کا آزاد نہ فیصلہ کر دے تو کوئی شکایت نہیں ہو سکتی۔

لیکن کام کو خوشگوار بنانے کی لاکھ کوشش کی جائے۔ بعض کام ضرور ناگوار رہیں گے۔ ان کاموں کی طرف تھوڑی محنت یا زیادہ اجرت کے ذریعے اکسایا جا سکتا ہے۔ اس سے جماعت کو ان شعبوں کے خوشگوار بنانے کا خیال بھی رہے گا۔

روپے پیسے کی کسی قسم کی چیز کی یہاں بھی ضرورت رہے گی۔ انارکسٹوں کی مفت تقسیم کی تجویز بھی تبادلہ کے کسی معیار کی ضرورت سے نجات نہیں دے گی۔ کیونکہ ایک شخص اپنا حصہ کسی رنگ میں لینا چاہے گا۔ دوسرا کسی میں اس کا آسان ترین طریقہ یہی ہے کہ سب کو تنخواہ دی جائے۔ اور ضرورت کے مطابق قیمتیں مقرر کر دی جائیں۔ لیکن اگر سکے دیئے جائیں تو ممکن ہے کوئی شخص انہیں جمع کرتے کرتے کسی وقت سرمایہ دار بن جائے۔ اسے روکنے کے لیے بہتر ہو گا کہ نوٹ ادا کیے جائیں۔ جو

تاریخ اجرا سے ایک سال تک کار آمد رہیں۔

انارکسٹوں کی اس تجویز کے متعلق بہت کچھ کہنا باقی ہے کہ اجناس اور دوسری ضروریات ہر ایک کو جس قدر وہ چاہے مفت مہیا کی جائیں اس تجویز کو اپنانے کا سوال ٹیکنکل ہے۔۔۔۔کیا حقیقت میں ایسا ممکن ہو گا اور کیا اس میں زیادہ تلخی تو نہیں ہو گی اور ضروریات پیدا کرنے کے لیے محنت کا دھارا ادھر تو نہیں موڑنا پڑے گا جب اسے دوسرے مفید کاموں میں لگایا جا سکتا ہے؟ میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے۔ پھر بھی جلد یا بدیر پیداوار کے طریقوں میں مسلسل ترقی سے بہت ممکن ہے کہ یہ انارکسٹی تجویز کامیاب ہو سکے۔ اور اس وقت اسے ضرور اپنا لینا چاہیے۔

عورتوں کو خواہ وہ بیاہی ہوں یا بن بیاہی خانہ داری میں اسی انداز سے تنخواہ ملے گی گویا وہ کسی صنعت میں کام کر رہی ہیں۔ اس سے بیویاں معاشی طور پر آزاد ہوں گی۔ جسے اور کسی طرح حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ننھوں کی ماؤں نے گھر کے باہر کام کرنے کی توقع نہیں کی جانی چاہیے۔

آجکل کی طرح بچوں کا خرچ والدین کے سر نہیں ہو گا۔ انہیں بھی بالغوں کی طرح اپنا حصہ ملا کرے گا۔ اور ان کی تعلیم مفت ہو گی۔ لائق لڑکوں میں وظیفوں کے لیے آج کا سارا مقابلہ نہیں ہو گا۔ بچپن ہی سے ان پر مقابلہ کا رنگ نہیں چڑھایا جائے گا۔ ان دماغوں کو حد سے زیادہ کام میں لانے پر مجبور کیا جائے گا۔ جس کا نتیجہ بعد کی عمر میں مردہ دلی اور عدم صحت ہوتا ہے۔ تعلیم آج سے کہیں زیادہ مختلف ہو گی اسے مختلف نوجوانوں کے مزاج کے موافق کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ شاگردوں کے اختراعی ذوق کو ترقی دینے کی زیادہ سعی کی جائے گی۔ اور ان کے دماغوں میں خاص اعتقادات اور خیالات کو جنہیں حکومت اچھا کہے گی۔ سمونے کی کم خواہش ہو گی کیونکہ اس سے پہلی سی کیفیت کو بحال رکھنے میں مدد ملتی ہے۔ اکثر بچوں کے لیے ملک میں سیروسیاحت اور مناظر قدرت کے ذریعے تعلیم بہت اچھی رہے گی۔ بڑے لڑکے لڑکیوں کے لیے جن کے رجحان ادبی یا آرٹ والے نہیں۔ ٹیکنیکل تعلیم کتابی تعلیم سے کہیں زیادہ اس دماغی سرگرمی کو بڑھانے والی ہو گی۔ جسے وہ (اگرچہ غلطی سے) امتحانوں کے

مقصد کے علاوہ کسی کام کا نہیں سمجھتے۔ حقیقی معنوں میں مفید تعلیم وہ ہے۔ جو بچے کے دلی رجحانات کی سمت میں چلتی ہے۔ جو کچھ وہ تلاش کرنا چاہتا ہے۔ مہیا کرتی ہے۔ خشک روکھی پھیکی اطلاع کو جس کا بچے کی خود رو آرزوؤں سے کوئی ربط نہیں ہوتا تعلیم نہیں کہتے۔

ہماری جماعت میں حکومت اور قانون دونوں ہوں گے۔ لیکن ان کے اختیارات بالکل گھٹا دیئے جائیں گے۔ کئی کاموں کی اجازت نہیں ہو گی۔۔۔۔ مثلاً قتل لیکن تعزیرات کا وہ دفتر بے معنی جس کا تعلق جائیداد سے ہے گاؤ خورد ہو چکا ہوگا اور آج کے اکثر قاتل اگرچہ محرک نہیں رہیں گے۔ اس کے باوجود بھی جو جرم کریں گے انہیں بدنام اور رسوا کیا جائے گا۔ اور فسادی نہیں سمجھا جائے گا۔۔۔۔ انہیں بدقسمت سمجھا جائے گا اور اس وقت تک کسی دماغی ہسپتال میں رکھا جائے گا۔ جب تک وہ شفا نہ پا جائیں تعلیم آزادی اور نجی سرمایہ کے خاتمہ سے جرائم کی تعداد بہت کم کی جا سکتی ہے۔ ہر ایک کا انفرادی علاج کرنے کے طریقے سے عموماً" ممکن ہو جائے گا کہ آدمی کی پہلی بھول' آخری بھول ہو۔ البتہ پاگل اور کمزور دماغ مستثنیٰ ہیں۔ جن کے لیے زیادہ طویل لیکن شفقت بھری نظربندی ضروری ہو گی۔

حکومت کے دو حصے ہو سکتے ہیں۔۔۔۔ جماعت یا اس کی دوسری شاخوں کے فیصلے اور ان فیصلوں کا نہ ماننے والوں پر عائد کرنا پہلے حصے پر انارکسٹوں کو بھی اعتراض نہیں۔ دوسرا حصہ ایک عام مہذب حکومت میں ممکن ہے۔ بالکل پچھلی صفوں میں رہے۔ بحث کے وقت جنہوں نے کسی نئے قانون کی مخالفت کی ہو۔ اصولاً" اس کے پاس ہو جانے کے بعد اس پر سر جھکا دیتے ہیں۔ کیونکہ ایک آئین پسند اور مستحکم جماعت میں رکاوٹ عموماً" عبث ہوتی ہے۔ لیکن حکومتی جبر کا امکان پھر بھی باقی ہے اور بلاشک اس سپر اندازی کا باعث ہے جو قوت کا استعمال غیر ضروری کر دیتی ہے۔ اگر جیسا کہ انارکسٹ چاہتے ہیں کوئی حکومت نہ ہو۔ تو اکثریت کے ظلم و ستم کے لیے اقلیت کے دروازے ہر وقت کھلے ہیں۔ فرق اسی قدر ہو گا کہ ان کی فوجیں یا پولیس مستقل اور پیشہ ور ہونے کے بجائے وقتی اور خاص اسی مقصد کے لیے ہوا کرے گی۔ اس کا اثر یہ

ہو گا کہ ہر ایک کو لڑائی کا کرتب سیکھنا پڑے گا۔ غرض انارکسٹوں کے مقاصد ان کے اپنے بتائے گئے طریقوں سے بھی پروان چڑھتے نظر نہیں آتے۔

انسان معاملات میں خواہ وہ ملک کے اندر ہوں یا باہر تشدد کا دور جب ہی ختم ہو سکتا ہے کہ کوئی طاقت ہو جو ہر قسم کے جبر کے استعمال کو غیر آئینی کہہ سکے۔ اور وہ اس قدر قوی ہو کہ اس کے سامنے کسی کا زور نہ چل سکے۔ البتہ جب آزادی کی حفاظت یا ناانصافی کی روک تھام کے لیے پبلک کی آواز بھی شامل ہو۔ ایسی طاقت ملک کے اندر ہوا کرتی ہے اور وہ حکومت ہے۔ لیکن بین الاقوامی معاملات میں ابھی اسے تخلیق کرنا ہے۔ مشکلیں ضرور حوصلہ فرسا ہیں۔ لیکن اگر دنیا کو میعادی لڑائیوں سے نجات دینا ہے۔ جن میں سے ہر ایک پہلی سے سوا ہو گی۔ تو ان پر غالب آنا ہی پڑے گا اس جنگ کے بعد کوئی مجلس اقوام بن سکے گی اور وہ اس کام کو نبھانے کے قابل ہو گی ابھی قیاس کرنا ناممکن ہے پھر بھی ہماری جنت کے شرمندہ تعبیر ہونے سے قبل جنگ کو روکنے کے لیے کچھ نہ کچھ قدم اٹھانا ہو گا۔ ایک بار لوگوں کو یقین ہو جائے کہ دنیا جنگ سے محفوظ ہے تو ساری مشکلیں حل ہو جائیں گی---- قومی فوجوں اور بیڑوں کی برطرفی اور ان کی جگہ غیر مہذب نسلوں سے حفاظت کی خاطر مختصر سی بین الاقوامی فوج رکھنے میں کوئی بڑی دشواری نہیں ہو گی۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد امن و امان خود استقبال کو آئیں گے۔

اکثریت کی حکومت جس پر انارکسٹ معترض ہیں۔ حقیقت میں کئی پہلوؤں سے تنقید کی زد میں آتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ قابل اعتراض۔ انتظامیہ کی وہ طاقت ہے جو اسے ان معاملات میں حاصل ہے۔ جن کا جمہور کی بہبودی سے گاڑھا میل ہے۔ مثلاً صلح اور جنگ لیکن کسی کو دامن جھٹک کر جدا نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ ان کے خطرات کو کم کر دینے کے دو طریق ہیں۔

1- اکثریت کی حکومت کو اس کے اختیارات بکھیر دینے سے کم پر تشدد کیا جا سکتا ہے۔ جن معاملات کا جمات کے کسی ایک طبقہ سے تعلق ہے۔ ان کے نپٹانے کے اختیارات اسی طبقہ کو دے دیئے جائیں نہ کہ مرکزی انجمن کو اس طرح لوگوں کو ان

فیصلوں پر جھکنے کے لیے مجبور نہیں کرنا پڑے گا جو حالات سے لاعلم اور بے تعلق اشخاص نے جلدی میں کیے ہوں گے اندرونی حالات میں اختیار صرف رقبوں کو ہی نہیں بلکہ ہر گروہ کو ملنے چاہئیں۔ جن کے ایسے ذاتی مفاد ہیں کہ ان میں باقی جماعت کا حصہ نہیں۔

2۔ جدید حکومت میں انتظامیہ کے ہاتھ میں بہت زیادہ طاقت کا باعث جلدی فیصلوں کی خصوصاً" خارجی معاملات میں آئے دن ضرورت ہے۔ اگر جنگ کا خطرہ نہ رہے تو زیادہ وسیع اور کم خود سر طریقے ممکن ہو جائیں اور مجلس قانون ساز کو کئی ایسے اختیارات واپس مل جائیں۔ جنہیں آج انتظامیہ دبائے ہوئے ہے ان دو طریقوں سے آزادی میں مداخلت کی شدت آہستہ آہستہ کم ہو سکتی ہے۔ کچھ نہ کچھ مداخلت حکومت کی رگ جان ہے۔ اور جب تک حکومت کا وجود ہے۔ اس کا رہنا ضروری ہے لیکن جب تک لوگ آج سے کم تشدد پسند نہ ہو جائیں۔ حکومتی جبر کی ایک خاص مقدار ان دونوں سے کم برائی ہے۔ ہمیں توقع کرنی چاہیے کہ جنگ کا خطرہ نہ رہنے سے لوگوں کے پرتشدد جذبات چیدہ چیدہ کم ہو جائیں گے۔ زیادہ تر اس لیے بھی کہ اس وقت اس انفرادی قوت کو بہت زیادہ گھٹا دینا ممکن ہو جائے گا۔ جو آج حاکموں کو فرعون بنا دیتی اور مخالفت کو کچلنے کی خاطر ہر ستم پر آمادہ کر دیتی ہے اس مقام پر جہاں حکومت کا جبر بھی غیر ضروری ہوتا ہے۔ زینہ بہ زینہ چڑھنے کی ضرورت ہے۔ اور اسی طرح ہی یہ ممکن بھی ہے۔ اس کے مکمل ہونے پر ہم انارکزم کے خواب کی تعبیر دیکھ سکتے ہیں۔

جس معاشی اور سیاسی نظام کا ہم نے خاکہ کھینچا ہے اس کا کرداری برائیوں پر کیسا اثر پڑے گا؟ میرا خیال ہے کہ بہت خاطر خواہ اثر ہو گا۔

لوگوں کے خیالات و تصورات کو جبر کے استعمال سے دور لے جانے میں سرمایہ داری نظام کے خاتمہ سے بہت مدد ملے گی۔ بشرطیکہ اس کی جانشینی سٹیٹ سوشلزم کو نہ ملے جس میں افسروں کے ہاتھوں میں وسیع اختیارات ہوں گے۔ آج سرمایہ دار کا دوسروں کی زندگی میں بہت دخل ہے۔ اس کے دوست حکومت میں اقتدار رکھتے ہیں اس کی معاشی قوت سیاسی قوت کے لیے اچھی مثال ہے۔ لیکن جس دنیا میں تمام مرد

اور عورتیں معاشی آزادی کی بہاریں دیکھتے ہوں- وہاں حکم کرنے کی عادت یا مطلق العنانی کی محبت رہے گی۔ اور آج سے کہیں زیادہ شائستہ کردار دھیرے دھیرے پیدا ہو جائے گا- اشخاص کی تعمیر ماحول کرتا ہے بطن مادر نہیں- موجودہ اقتصادی نظام کا کردار پر بڑا اثر اور اجتماعی ملکیت سے توقع کیے گئے- بادرجہ بہتر نتائج انقلاب' انقلاب پکارنے کے سب سے زبردست اسباب ہیں-

جس دنیا کا ہم تصور کر رہے ہیں- وہ مالی خوف اور مالی ہوس سے بے داغ ہو گی- اس میں کسی کو افلاس کا بھوت نہیں ستائے گا- اور نہ دولت کی آرزو بے رحم بنا دے گی- آج کی طرح وہاں معاشی جماعتوں کی تفریق نہیں ہو گی- ناکام پیشہ ور اس غم میں نہیں گھلے گا کہ کہیں اس کے بچوں کی ناؤ بھی اسی چٹان سے نہ ٹکرا جائے بڑھے ہوئے حوصلوں والے ملازم کو وہی روز بد دیکھنے کا کھٹکا نہ ہوگا- معمور تمنا نوجوانوں کو کاروباری کامیابی اور مقابلہ کرنے والوں کی تباہی اور محنت کے زوال سے نچوڑی ہوئی دولت کے خوابوں کی جگہ دوسرے خواب دیکھنے کو ہوں گے ایسی دنیا میں نیندیں حرام کر دینے والے اکثر تفکرات نہیں ہوں گے- حرص اور آرزو کو اس سے زیادہ شریفانہ روپ لینے پڑیں گے- جو آج تجارتی سماج اکسا رہا ہے رفاہ عامہ کے کام صرف خوش نصیب افراد کے لیے ہی نہیں- بلکہ ہر ذوق شوق والے کے لیے کھلے ہوں گے- سائنس سے محنت گھٹانے والی ایجادیں- ہر قسم کی ٹیکنیکل ترقی اور اس کے ساتھ آج سے کئی گنا پھولنے پھلنے کی توقع کی جا سکتی ہے- کیونکہ اعزاز کی راہ وہی ہو گی- سوشلسٹ سماج میں آرٹ کا پنپنا بہت کچھ سوشلزم کی ہیئت پر منحصر ہے- اگر حکومت یا کوئی اور طاقت اسے محدود رکھنے پر زور دیتی ہے' اور انہیں کو لائسنس دیتی ہے- جنہیں وہ اس قابل سمجھتی ہے- تو انجام معلوم- لیکن اگر آزادی حقیقی معنوں میں ہو اور ہر ایک کو کچھ آسائش قربان کرکے آرٹسٹ بن جانے کی اجازت ہو تو ممکن ہے- کہ پرامید فضا اور معاشی مجبوری کا نہ ہونا لوگوں کے جوہر اس قدر برباد نہ ہونے دے جس قدر موجودہ نظام میں دیکھے جاتے ہیں اور جہاد زیست میں امنگوں کا رقص لبسمل کم ہو جائے-

ابتدائی ضروریات کے پورا ہو جانے پر اکثر لوگوں کی گہری مسرت دو باتوں پر منحصر ہے---- ان کا کام اور ان کے لوگوں سے تعلقات۔ جس دنیا کی ہم تصویر لے رہے ہیں۔ اس میں کام بلاجبر۔ مناسب اور اجتماعی جدوجہد کے مفاد پر ہوگا۔ اور ہر جزو حقیر اس میں تخلیقی مسرت محسوس کرے گا۔ لوگوں سے راہ و رسم میں بھی اس قدر فوائد ہوں گے جس قدر کام میں۔ قابل قدر انسانی تعلقات وہی ہیں جن کی جڑیں باہمی آزادی میں ہوں۔ جہاں کوئی تسلط اور کوئی غلامی نہیں۔ محبت کے سوا کوئی زنجیر نہیں اور اندرونی زندگی کے مرجانے پر کسی ظاہر داری کی معاشی یا اعتقادی ضرورت نہیں۔ بنیا سماج کا سب سے مہیب پہلو مرد اور عورت کے تعلقات کو مسموم کرنا ہے۔ بیسوائی کی برائیاں عموماً" تسلیم کی جاتی ہیں۔ لیکن ان سے کہیں زیادہ خراب شادی پر معاشی حالات کا اثر ہے۔ شادی میں اکثر سودے کا رنگ آ جاتا ہے اور عورت کو مادی آسائش کے ایک خاص معیار میں رکھنے کی شرط پر حاصل کیا جاتا ہے۔ بہت دفعہ شادی بیسوائی کی مترادف ہو جاتی ہے اور فرق صرف یہی رہ جاتا ہے کہ اس سے چھٹکارا سہل نہیں ہوتا۔ ان سب برائیوں کی جڑ معاشی ہے۔ معاشی اسباب شادی کو تجارت کا رنگ دے دیتے ہیں جس میں خاص اضافہ ہوتا ہے اور اس کا فقدان طلاق کا مسلمہ باعث نہیں بنتا۔ شادی آزاد ہونی چاہیے۔ یہ دو دلوں کا ملاپ ہے۔ اس سے وہ مسرت چھلکنی چاہیے جو خوف کے احساس سے بیداغ ہو۔ اس میں باہمی احترام اس حد تک دخیل ہو کہ کسی کی آزادی میں خفیف سی مداخلت کا سوال پیش نہ آئے۔ اور مشترکہ زندگی کے ٹھونسنے کا سوال ہی محال ہو۔ وکیلوں کا شادی کے متعلق نظریہ یہ نہیں ہے۔ نہ پنڈتوں ملاؤں کا جو ایک ایسے رواج کو مذہبی تقدیس دے دیتے ہیں جو قانونی خاوند کی بدمست سفاکیوں اور وحشی جذبات پرستیوں میں بھی کچھ نہ کچھ پاکیزگی دیکھ لیتا ہے۔ آج اکثر مرد اور عورتیں شادی کو آزادی کے رنگ میں نہیں دیکھتے---- قانون دوسروں کی آزادی چھیننے کی مسرت کے لیے مداخلت کی آرزو پورا کرنے کا موقعہ دیتا ہے اور ہر ایک اپنی آزادی کے تھوڑے بہت نقصان کو گوارا کر جاتا ہے۔ اس پر نجی ملکیت کی فضا کسی اچھے خیال کو جڑ پکڑنے ہی نہیں دیتی۔

جب معاشی غلامی کی مردہ وراثت ہمارے جذبات ڈھالنے کی سی رہ جائے گی۔ انسانی تعلقات کا یہ اندازہ نہیں رہے گا۔ خاوند اور بیوی والدین اور اولاد محض عقیدت کے ذریعے اکٹھے رکھے جائیں گے۔ جہاں محبت مر چکی ہو گی۔ یہ تسلیم کر لیا جائے گا کہ اب ایسی کوئی چیز نہیں رہی جس کی سلامتی درکار ہو۔ پھر چونکہ محبت آزاد ہو گی۔ اس لیے مرد اور عورتیں نجی زندگی میں قبضہ کی خواہش کے لیے محرک اور نکاس نہ پائیں گے۔ لیکن ان کی محبت کے تخلیقی عناصر کے لیے کھلا میدان ہوگا۔ محبت آج سے کہیں زیادہ پاکیزگی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہو گی۔۔۔۔ آج کل اکثر لوگ اپنی بیویوں سے اس طرح محبت کرتے ہیں۔ جس طرح بھیڑ کے گوشت سے گویا کوئی کھانے اڑانے کی چیز ہے لیکن معصوم محبت میں ایک اور ہی لطف ہے جسے آقائی میں نہیں پا سکتے ایک لطف جو نرا جذبات کو ہی نہیں روح کو بھی تسکین دیتا ہے اور شاداب زندگی کے لیے دل اور روح دونوں کی تسکین ضروری ہے۔ مرد یا عورت کے اچھے جذبات بھی جب ہی کھل سکتے ہیں۔

ہماری دنیا میں موجودہ روزمرہ زندگی کی بے کیف ٹریجڈی سے کہیں زیادہ جینے کا مزا ہے۔ آج نوجوانی کے بعد کل کی فکر اکثر انسانوں کی پشت خم کر دیتی ہے۔ ان میں شگفتہ مزاجی کا نام تک نہیں رہتا۔ ہاں کبھی کبھی خاص خاص وقفوں میں ان کے لبوں پر ایک متین سی مسکراہٹ آ جاتی ہے۔ "تھوڑی اولاد" کا مشورہ کئی پہلوؤں سے اکثر لوگوں کے لیے مفید ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ایک اور مقولہ بھی ہے کہ کل کی فکر نہ کرو، جسے اس دوڑ دھوپ کی دنیا میں قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اہل علم لوگوں میں بڑھاپے کے وقت بھی اکثر بچپن کی سادگی پائی جاتی ہے۔۔۔۔ نظری باتوں میں ان کی محویت انہیں دنیا سے ایک طرف رکھتی ہے اور ان کے کام کی وقعت ان کی سادگی کے باوجود انہیں زندہ رکھتی ہے۔ یہ لوگ ایسی زندگی بسر کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ جیسی ہر ایک کو بسر کرنے کے قابل ہونا چاہیے تھا۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ معاشی پیکار اکثریت ان کی سی زندگی ناممکن کر دیتی ہے۔

لیکن ہماری پیش کی گئی دنیا کا طبعی برائیوں پر کیا اثر ہوگا؟ کیا محنت کی ایک مقدار

اب سے زیادہ پیداوار دے گی؟ یا آبادی سامان زندگی کی حدود پر دباؤ ڈالے گی۔ جیسا کہ مالتھس نے گاڈون کی رجائیت کو جھٹلانے کے لیے کہا تھا؟

میرے خیال میں ان تمام سوالوں کا جواب انجام کار کسی جماعت سے توقع کی گئی ذہنی قوت پر آ ٹھہرتا ہے۔ جس نے معاشی مقابلہ کا آنکس پھینک دیا ہو۔ کیا ایسی دنیا میں لوگ سست اور لاابالی ہو جائیں گے؟ کیا ان میں تفکر نہیں رہے گا؟ کیا سوچنے والوں کے سامنے خالی الذہن قدامت کی نہ پھاند سکنے والی دیوار آج سے زیادہ بلند ہو گی؟ یہ بڑے اہم سوال ہیں۔ کیونکہ آخر انسانوں کو طبعی برائیوں سے نپٹنے کے لیے سائنس کی طرف ہی رجوع کرنا ہے۔

اگر باقی وہ باتیں پوری ہو جائیں جنہیں ہم نے ضروری بتایا ہے تو بہت یقینی ہے کہ بیماریاں آج سے کم ہو جائیں۔ آبادی تنگ و غلیظ رقبوں میں اٹی نہیں ہو گی۔ بچوں کو کہیں زیادہ ہوا اور کھلی فضا میسر آئے گی کام کے اوقات مناسب ہوں گے۔ آج کی طرح حد سے زیادہ اور گھلا دینے والے نہیں ہوں گے۔

سائنس کی ترقی زیادہ تر نئے سماج میں ذہنی آزادی کی مقدار پر منحصر ہے۔ اگر اس پر حکومت کا سایہ ہوگا۔ تو بہت جلد اس کی نشوونما رک جائے گی۔ بنیادی پیش قدمیاں نہیں ہو سکیں گی۔ کیونکہ ان کے ہونے سے پہلے وہ اس قدر شکوک پیدا کریں گی کہ پبلک سرمایہ ان پر خرچ نہیں کیا جائے گا اقتدار بڑوں کے ہاتھوں میں ہوگا۔ خصوصاً وہ جنہوں نے سائنس میں نام پیدا کیا ہوگا۔ ایسے لوگ ان نوجوانوں کو دشمنی کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ جو ان تھیوریوں پر سر جھکا کر خوشامد کرنے کے عادی نہیں ہوں گے۔ دفتر شاہی اور سٹیٹ سوشلزم میں ڈر ہے کہ سائنس ترقی پسند ہونے سے رہ جائے گی اور اس میں وہی وسطی زمانہ کی اقتدار پرستی عود کر آئے گی۔

لیکن کسی نظام میں جو ہر قسم کے طبقوں کو اس قدر اہل علم رکھنے کے قابل کرے گا۔ جس قدر وہ پسند کریں اور کسی نئے اور اچھوتے کام میں کودنے والوں کو محض روزینہ ارزاں کرے گا۔ ہر طرح امید کی جا سکتی ہے کہ سائنس اس قدر پھلے پھولے کہ آج تک دیکھا نہ سنا ہو۔ اس وقت ہمارے نظام کی راہ میں کسی طبعی رکاوٹ کا

امکان نہیں ہو سکتا۔

کام کے اوقات کا سوال کچھ ٹیکنیکل ہے اور کچھ تنظیمی۔ یہ تو مسلمہ امر ہے کہ اسلحہ جات، قومی مدافعت اشتہار بازی، امیروں کے لیے گراں قیمت سامان عیش یا ہمارے مقابلہ پرور نظام کی دوسری بیہودہ باتوں پر محنت ضائع نہیں کی جائے گی۔ اگر ہر صنعتی گلڈ ایک عرصہ کے لیے کسی نئی ایجاد یا طریقے سے فائدہ حاصل کر لے تو یقین کامل ہے کہ ٹیکنکل ترقی کو بہت مدد ملے۔ انکشاف یا ایجاد کرنے والے کی زندگی بذات خود پسند آنے والی ہے---- آج بھی اسے اختیار کرنے والے لالچ کے نہیں۔ بلکہ کام کی دلچسپی اور اعزاز کی امید کے اکسائے ہوتے ہیں۔ اور اس کے لیے آج سے کہیں کھلا میدان ہوگا۔ ذہن زیادہ انہاک اور تخلیقی ارادوں سے اسی فضا میں کام کرتا ہے۔ جہاں دل کم پریشان ہو۔ زندگی کا لطف زیادہ اور جہاں لوگوں میں آج سے زیادہ عزم ہو۔

اب آبادی کا سوال باقی ہے۔ جو مالتھس کے وقت سے لے کر ان لوگوں کی آخری پناہ رہا ہے۔ جو کبھی اچھی دنیا کے امکان کو ناگوار کہتے ہیں۔ لیکن ایک صدی قبل سے اب اس کی نوعیت اور ہو گئی ہے۔ تمام مہذب ممالک میں شرح پیدائش میں زوال جس کا جاری رہنا یقینی ہے۔ خواہ کوئی معاشی نظام اپنا لیا جائے۔ پکارتا ہے (خصوصاً جب جنگ کے غاصب اثرات کو بھی سامنے رکھا جائے) کہ مغربی یورپ کی آبادی موجودہ سطح سے بڑھنے سے رہی اور امریکہ میں بھی صرف لوگوں کے باہر سے آ کر آباد ہونے سے زیادہ ہو سکتی ہے۔ گرم منطقوں میں شاید حبشی بڑھتے رہیں۔ لیکن وہ معتدل خطوں کے سفید فاموں کے لیے خطرہ نہیں ہو سکتے۔ البتہ زرد خطرہ ضرور ہے۔ لیکن اس کے طاقت میں آنے تک خود ایشیا کی شرح پیدائش گھٹنے لگ گئی ہو گی۔ اس سوال کے نپٹنے کے اور بھی طریقے موجود ہیں۔ لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ اسے اپنی امید کی راہ میں رکاوٹ سمجھ لیا جائے۔ خاتمہ پر میں کہتا ہوں۔ کہ اگرچہ کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی تاہم آبادی کے مسئلہ کو سوشلزم کی راہ میں سد سکندری سمجھنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔

ہماری بحث ہمیں اس یقین پر لائی ہے کہ زمین اور سرمایہ کی اجتماعی ملکیت جو

سوشلزم اور انارکزم کی روح رواج ہے موجودہ دور کی خرابیوں کو دور کرنے اور ایک ایسا سماج پیدا کرنے کے لیے جو ہر سمجھدار انسان کا مقصود ہو سکتی ہے۔ ضروری قدم ہے لیکن ضروری قدم ہوتے ہوئے بھی تنہا سوشلزم کسی طرح کافی نہیں کہی جا سکتی۔ اس کی کئی شکلیں ہیں سٹیٹ سوشلزم میں ظلم کے خطرات اور ترقی میں مداخلت کا ڈر ہے۔ جس سے موجودہ دور سے بھی بدتر دور پیدا ہو سکتا ہے۔ دوسری طرف انارکزم ہے۔ جس میں سٹیٹ سوشلزم کے خطرات تو نہیں۔ مگر اس کے اپنے خطرے اور دشواریاں ہیں۔ جن کے سبب قائم ہو جانے کے بعد زیادہ عرصہ تک اس کا زندہ رہنا ممکن معلوم نہیں ہوتا۔ ہاں یہ ایک آدرش ہے۔ جس تک پہنچنے کے لیے حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے۔ اور ممکن ہے کسی وقت پورے طور پر حاصل ہو سکے۔ سنڈیکلزم میں کئی انارکسزم والے نقائص ہیں اور اس کی پائیداری بھی مشکوک ہے۔ کیونکہ مرکزی حکومت کی ضرورت اپنا آپ منوا کر رہے گی۔

ہمارے خیال میں عہدہ دار گلڈیوں کی جگہ انارکزم کی طرف جھکتی ہوئی گلڈ سوشلزم ہر طرح پسندیدہ رہے گی۔ سیاست دان بھول جاتے ہیں کہ سائنس اور آرٹ' انسانی تعلقات اور زندگی کی مسرت کے پیش نظر انارکزم بہترین ہے۔ اور انہیں باتوں کے لیے ہم نے محض روزینہ کی کمی و بیش انار کسٹی تجویز کو شامل کر لیا ہے۔ معاشیات اور سیاسیات کے ظاہر و باطن پر ان کے اثرات ہی سے کسی مجلسی نظام کو پرکھنا چاہیے اور اگر کبھی سوشلزم کا دور شروع ہو جائے تو اسی صورت میں مفید ثابت ہو سکتا ہے کہ غیر معاشی اقتدار کی قدر کی جائے۔ اور سوجھ بوجھ کے ساتھ ان کا ساتھ دیا جائے۔

ہمیں ایک ایسی دنیا کی تلاش کرنی چاہیے جس میں تخلیقی روح زندہ ہو۔ جس میں زندگی مسرت اور ارمان سے معمور ہنگامہ ہو۔ جس کی بنیاد دوسروں کی چیزیں ہتھیانے اور اپنی کو تھامے رکھنے کی آرزو کی نسبت تعمیری جذبہ پر ہو جس میں عقیدت کھل کھیل سکے۔ محبت میں ابوالہوسی نہ ہو۔ ظلم اور حسد کا نام نہ ہو۔ مسرت اور زندگی کی تعمیر کرکے ان میں ذہنی مسرتوں کے چراغ

روشن کرنے والے جذبات کی بے روک نشوونما ہو ایسی دنیا ممکن ہے تو اسے صرف ان لوگوں کی انتظار ہے جو اسے پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

ہماری موجودہ دنیا کے ارادے کچھ اور ہیں لیکن وہ اپنے ہی گرم جذبات کی آگ میں جل کر بھسم ہو جائے گی۔ اور جس کی راکھ سے ایک نئی دنیا پیدا ہو گی جس کا دل امنگوں سے لبریز اور جس کی آنکھوں میں نور سحر کی چمک مسکرا رہی ہو گی۔

فکشن ہاؤس کی شاہکار کتابیں

انسان بڑا کیسے بنا؟	میخائل ایلین/ ایلینا سیگاں	170/-
خاندان ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز	فریڈرک اینگلس	150/-
سرمایہ	کارل مارکس	90/-
مارکسی فلسفہ اور جدید سائنس	ایلن ووڈز/ ٹیڈ گرانٹ	400/-
پاکستان میں امریکی کردار	ایم۔ ایس وینکٹے رامانی	300/-
جاگیرداری اور سامراج	حمزہ علوی	170/-
پاکستان کی قومیتیں	یوری گنکوفسکی	150/-
جاگیرداری	ڈاکٹر مبارک علی	150/-
من ویزداں	علامہ نیاز فتح پوری	400/-
کائنات	کارل ساگان	180/-
پنجاب میں بائیں بازو کی سیاست	اجیت جاوید	180/-
ماں	میکسم گورکی	200/-
تین راہی	میکسم گورکی	250/-
ذلتوں کے مارے لوگ	فیودر دستوئیفسکی	175/-
باپ اور بیٹے	ایوان ترگنیف	160/-
حاجی مراد	لیوٹالسٹائی	90/-
سدھارتھ	ہرمن ہیسے	90/-
اور ڈان بہتا رہا	میخائل شولوخوف	350/-
کنوارے کھیت	میخائل شولوخوف	250/-

پڙهندڙ نسُل . پَ نَ
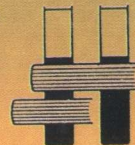
The Reading Generation

1960 جي ڏهاڪي ۾عبدالله حسين ” اُداس نسلين“ نالي ڪتاب لکيو. 70 واري ڏهاڪي ۾ وري ماڻِڪَ ”لُڙهندَڙ نَسُل“ نالي ڪتاب لکي پنهنجي دورَ جي عڪاسي ڪرڻ جي ڪوشش ڪئي. امداد حُسينيءَ وري 70 واري ڏهاڪي ۾ئي لکيو:

انڌي ماءُ ڄڻيندي آهي اونڌا سونڌا ٻارَ
ايندڙ نسل سَمورو هوندو گونگا ٻوڙا ٻارَ

هر دور جي نوجوانن کي اُداس، لُڙهندَڙ، ڪَڙهندڙ، ڪُڙهندڙ، ٻَرندڙ، ڇُرندڙ، ڪِرَندڙ، اوسيئڙو ڪَندَڙُ، ياڙي، ڪاڙُو، ياڃوڪَڙُ، ڪاوڙيل ۽ وِڙهندڙ نسلن سان منسوب ڪري سگهجي ٿو، پَر اسان اِنهن سيني وِچان ”پڙهندڙ“ نسل جا ڳولائو آهيون. ڪتابن کي ڪاڳر تان ڪٽي ڪمپيوٽر جي دنيا ۾ آڻڻ، ٻين لفظن ۾ برقي ڪتاب يعني e-books ناهي ورهائڻ جي وسيلي پڙهندڙ نسل کي وَڌڻ، ويجهَڻ ۽ هِڪ ٻِئي کي ڳولي سَهڪاري تحريڪ جي رستي تي آڻِڻَ جي آسَ رکون ٿا.

پَڙھندڙ نَسل (پَـنَ) ڪا بہ تنظيمَ ناھي. اُنَ جو ڪـو بـہ صدر، عُھديدار يا پايو وِجھندڙ نہ آھي. جيڪڏھن ڪو بہ شخص اھـڙي دعوىٰ ڪري ٿـو تـہ پَـڪَ ڄاڻو تـہ اُھو ڪُـوڙو آھي. نـہ ئي وري پَـنَ جي نالي ڪي پئسا گڏ ڪيا ويندا. جيڪـڏھن ڪـو اھڙي ڪوشش ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُھو بہِ ڪُوڙو آھي.

جھڙيءَ طَرَح وڻـن جا پَـنَ ساوا، ڳاڙھا، نيرا، پيلا يا ناسي ھوندا آھن اَھڙيءَ طرح پَڙھندڙ نَسُل وارا پَـنَ بہ مختَلِف آھـن ۽ ھوندا. اُھي ساڳِئي ئي وقت اُداس ۽ پڙھندڙ، بَرندڙ ۽ پڙھندڙ، سُست ۽ پڙھندڙ يا وِڙھندڙ ۽ پڙھندڙ بہ ٿي سگھن ٿا. ٻيـن لفظن ۾ پَـنَ ڪا خُصوصي ۽ تالي لڳل ڪِلَب Exclusive Club نہ آھي.

ڪوشش اھا ھوندي تـہ پَـنَ جا سڀ ڪَم ڪـار سَـھڪاري ۽ رَضاڪار بنيادن تي ٿين، پر ممڪن آھي تہ ڪي ڪم اُجرتي بنيادن تي بہ ٿِين. اھڙي حالت ۾ پَـنَ پاڻ ھِڪَٻِئي جي مدد ڪَـرڻ جي اُصـولَ ھيٺ ڏي وَٺُ ڪنـدا ۽ غيرتجارتي non-commercial رھنـدا. پَـنَـن پـاران ڪتـابن ڪـي ڊِجيِٽـائِيز digitize ڪرڻ جي عَملَ مان ڪو بہ مالي فائدو يا نفعو حاصل ڪرڻ جي ڪوشش نہ ڪئي ويندي.

ڪتابن ڪي ڊِجيِٽائِيز ڪرڻ ڪان پو ٻيو اھم مرحلو وِرھائڻ distribution جو ٿيندو. اِھو ڪم ڪرڻ وارن مان جيڪڏھن ڪو پيسا ڪمائي سگھي ٿو تہ پلي ڪمائي، رُڳو پَنَـن سان اُن جو ڪو بہ لاڳاپو نہ ھوندو.

پَنَن کي کُليل اکرن ۾ صلاح ڏجي ٿي تہ هو وَسَ پٺاندڙ وڏِ کان وَڏِ ڪتاب خريد ڪَري ڪتابن جي ليکڪَن، ڇپائيندڙن ۽ ڇاپيندڙن کي هِمٿائِن. پر ساڳِئي وقت عِلم حاصل ڪرڻ ۽ ڄاڻ کي ڦهلائڻ جي ڪوشش دوران ڪَنهن بہ رُڪاوٽَ کي نہ مڃن.

شيخ اَيازَ علمَ، ڄاڻَ، سمجهہَ ۽ ڏاهپَ کي گيتَ، بيتَ، سِٽَ، پُڪارَ سان تَشبيهہ ڏيندي انهن سيني کي بَمن، گولين ۽ بارودَ جي مدِ مقابل بيهاريو آهي. اياز چوي ٿو تہ:

گيتَ بہِ جڻ گوريلا آهن، جي ويريءَ تي وار ڪَرن ٿا.

... ...

جِئن جِئن جاڙ وڌي ٿي جَڳَ ۾، هو بوليءَ جي آڙ ڇُپن ٿا؛
ريتيءَ تي راتاها ڪن ٿا، موٽي مَنجهہِ پهاڙ ڇُپن ٿا؛

... ...

ڪالهہَ هُيا جي سُرخ گُلن جيئن، اڄ ڪلهہ نيلا پيلا آهن؛
گيتَ بہِ جڻ گوريلا آهن........

... ...

هي بيتُ اَٿي، هي بَم- گولو،
جيکي بہ ڪٽين، جيکي بہ ڪٽين!
مون لاءِ ٻنهي ۾ فَرَقُ نہ آ، هي بيتُ بہ بَمَ جو ساٿي آ،
جنهن رِڻَ ۾ رات ڪَيا راڙا، تنهن هَڏَ ۽ چَمَ جو ساٿي آ ـ

اِن حسابَ سان اڄ ڪالهہ ڪتابن کي پاڻَ تي اِهو سوچي مَڙهڻ تہ "هاڻي ويڙهہ ۽ عمل جو دور آهي، اُن ڪري پڙهڻ تي وقت نہ وڃايو" ناداني جي نشاني آهي.

پَڑهن جو پڙهڻ عام ڪِتابي ڪيڙن وانگر رُڳو نِصابي ڪتابن تائين محدود نہ هوندو. رڳو نصابي ڪتابن ۾ پاڻ کي قيد ڪري ڇڏڻ سان سماج ۽ سماجي حالتن تان نظر ڪڇي ويندي ۽ نتيجي طور سماجي ۽ حڪومتي پاليسيون policies اڻڄاڻن ۽ نادانن جي هٿن ۾ رهنديون. پَڙهَ نِصابي ڪتابن سان گڏوگڏ ادبي، تاريخي، سياسي، سماجي، اقتصادي، سائنسي ۽ ٻين ڪتابن کي پڙهي سماجي حالتن کي بهتر بنائڻ جي ڪوشش ڪندا.

پَڙهندڙ نَسُل جا پَڙهَ سيني کي **چو، ڇالاءِ ۽ ڪيئن** جهڙن سوالن کي هر بَيانَ تي لاڳو ڪرڻ جي ڪوشَ ڏين ٿا ۽ انهن تي ويچار ڪرڻ سان گڏ جوابَ ڳولڻ کي نہ رڳو پنهنجو حق، پر فرض ۽ اٽَر گهرج unavoidable necessity سمجهندي ڪتابن کي پاڻ پڙهڻ ۽ وڌ کان وڌ ماڻهن تائين پهچائڻ جي ڪوشش جديد ترين طريقن وسيلي ڪرڻ جو ويچار رکن ٿا.

توهان بہ پڙهڻ، پڙهائڻ ۽ ڦهلائڻ جي اِن سهڪاري تحريڪ ۾ شامل ٿي سگهو ٿا. بَس پنهنجي اوسي پاسي ۾ ڏِسو، هر قسم جا ڳاڙها ٽوڙي نيرا، ساوا توڙي پيلا پَن ضرور نظر اچي ويندا.

وڻ وڻ کي مون ياڪِي پائي چيو تہ ”منهنجا ياءُ
پهتو منهنجي من ۾ تنهنجي پَنَ پَنَ جو پڙلاءُ“.
- اياز (ڪلهي پاتم ڪينرو)